سمندر اور جزیرے
خالد سہیل

سمندر اور جزیرے

منتخب غزلیں، قطعات، نظمیں

۱۹۷۵ء ... ۲۰۰۵ء

خالد سہیل

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

کتاب:......................................سمندر اور جزیرے

شاعر:......................................ڈاکٹر خالد سہیل

اشاعت:......................................۲۰۰۶ء

تعداد:......................................ایک ہزار

پیشکش:......................................درویشوں کا ڈیرا ... کینیڈا

کمپوزنگ:......................................محمد سلطان ظفر

Sultan@SultanZafar.com

ملنے کا پتہ: Dr. Khalid Sohail..................................
Creative Psychotherapy Clinic
213 Byron St. South,
Whitby, Ontario, Canada L1N 4P7

ویب سائٹ: www.DrSohail.com....................

ای میل: welcome@DrSohail.com......................

جزیرے

غزلیں

قطعات

نظمیں

دوستوں کی آراء

سچ کی تلاش میں

میرے پہلے شعری مجموعے کا نام 'تلاش' تھا اور وہ تلاش کا سفر آج بھی جاری ہے۔
میں جب اپنے ماضی کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پچھلی چند دہائیوں سے اپنے سچ کی تلاش اور پھر اس سچ کے تخلیقی اظہار کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میرے لئے یہ سفر عرفانِ ذات سے عرفانِ کائنات کا سفر رہا ہے۔ مجھے کئی دفعہ اس حقیقت کا احساس ہوا کہ

اپنی ذات سے غافل ہوں
آنکھیں ہیں اور اندھا ہوں

لیکن جب میں اس سفر میں آگے بڑھتا چلا گیا تو پھر مجھے اس کیفیت کا عرفان ہوا کہ

میں اپنی ذات کی گہرائیوں میں جب اترتا ہوں
اندھیروں کے سفر میں روشنی محسوس کرتا ہوں

اس طویل اور پیچیدہ تخلیقی سفر میں میرے لئے اپنے مشاہدے اور تجربے کی ترسیل زیادہ اہم اور صنف کا چناؤ ثانوی رہا ہے۔ میں نے غزلیں بھی لکھی ہیں نظمیں بھی' مقالے بھی تخلیق کئے ہیں افسانے بھی' انٹرویو بھی لئے ہیں اور عالمی ادب کے شہہ پاروں کے تراجم بھی کئے ہیں۔ میرے لئے میرے فن پارے میرے اور قاری کے درمیان محبت کے پل تعمیر کرتے ہیں۔ ان پلوں سے گزر کر الفاظ میرے جذبات' احساسات' خیالات اور نظریات قاری کے ذہن اور قلب تک پہنچاتے ہیں۔ ایک لکھاری ہونے کے ناطے چونکہ میں ابلاغ کو بہت اہمیت دیتا ہوں اسلیے میں فلسفیانہ بھول بھلیوں میں کھونے کی بجائے اپنے سچ کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں سہلِ ممتنع فن کا کمال ہے۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے اردو شاعری میں محبت ایک اہم موضوع رہا ہے لیکن مشرقی روایات کی وجہ سے اردو کے شاعر کی محبوبہ اس کی شریکِ سفر نہیں بن پاتی اور شریکِ حیات اس کی محبوبہ نہیں ہوتی اس لئے اردو شاعری میں ہجر کا ذکر زیادہ ہے اور وصل کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر۔ مشرق کا شاعر اور عاشق ایک داخلی تضاد کا شکار ہے۔

بقول منیر نیازی

'مجھے تجھ سے محبت ہے'

بس اتنی بات کہنے کو

لگے بارہ برس مجھ کو

میں اس حوالے سے خوش قسمت رہا ہوں ہوں کہ مغرب میں زندگی گزارنے کی وجہ سے مجھے ہجر کی نسبت وصال زیادہ ملا ہے اسی لئے میں نے لکھا ہے

ہجر کے برسوں پر بھاری
وصل کا میں اک لمحہ ہوں

اردو کے وہ شاعر جو مشرق سے مغرب میں آبسے ہیں ان میں سے اکثر کا سفر ہجر کے کرب سے ہجرت کے کرب تک کا سفر رہا ہے۔ان کی شاعری میں نوسٹلجیا زیادہ ملتا ہے' زندگی سے لطف اندوز ہونے کا تجربہ کم۔میں نے جب اپنی زندگی کی حسیں شامیں اپنی محبوبہ کے ساتھ گزاریں تو لکھا

نئے مقام پہ محبوب بھی نئے پائے
جزائیں ملتی رہی ہیں ہمیں یہ ہجرت کی

اردو کے مہاجر شاعر سزاؤں کا ذکر تو کرتے ہیں جزاؤں کا نہیں۔لیکن اس وصل میں جہاں رومانس اہم تھا وہیں محبوبہ سے دوستی بھی اہم تھی۔

وصل کی لذتوں کا مزا چھوڑ کر
آؤ کچھ دیر کو ہم بھی باتیں کریں

اردو شاعری اور ادب میں عورت اور مرد کا رشتہ روایتی رشتہ ہی رہتا ہے جس میں جنس اور شادی تو در آتے ہیں لیکن دوستی نہیں ہو پاتی۔مغرب میں جب میرے عورت سے رشتے میں محبت' رومانس اور دوستی گھل مل گئے تو میں کہہ سکا

تو مری دوست بھی ہمراز بھی محبوبہ بھی

اپنے سچ کی تلاش میں جب میں نے اپنے معاشرے کے مذہبی اعتقادات اور ماحول کی فرسودہ روایات کو پیچھے چھوڑا تو پھر آگے بڑھ کر انسان دوستی کی روایت کو گلے لگا سکا۔اس روایت نے نہ صرف مجھے

احترامِ آدمیت کا درس پڑھایا بلکہ یہ بھی بتایا کہ ہم سب انسان چاہے کسی بھی رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، دھرتی ماں کے بچے ہیں۔ ہم ہزاروں سالوں کے سفر کے بعد اکیسویں صدی میں اس دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں یا تو ہم پوری انسانیت کو ارتقا کی اگلی منزل تک لے جائیں گے اور اسی زمین پر جنت الفردوس بنائیں گے اور یا اجتماعی قتل کے ذمہ دار ہوں گے۔

میری نگاہ میں ہر قوم کے ارتقا کے لئے ضروری ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ کو فروغ دے۔ چاہے وہ شاعری ہو یا افسانہ، فلم ہو یا ڈرامہ، رقص ہو یا موسیقی، وہ سب انسانوں کی حسِ جمالیات کو فروغ دیتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ ہمیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں مدد کرتے ہیں تا کہ ہمارے دلوں کی کھڑکیاں اور دماغوں کے دروازے کھلے رہیں اور ہم گناہ وثواب سے اوپر اٹھ کر زندگی سے محظوظ ہوں۔ جس قوم میں فنونِ لطیفہ فروغ نہیں پاتے وہاں سیاسی شدت پسندی اور مذہبی تشدد پسندی پروان چڑھتے ہیں اور وہاں کے عوام اخوت اور محبت کی بجائے تعصب اور نفرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہاں کے رہنما شاعروں، ادیبوں، فلسفیوں اور فنکاروں پر فتوے لگانے شروع کر دیتے ہیں اور انہیں یا تو جیل بھیج دیتے ہیں اور یا سولی پر چڑھا دیتے ہیں۔

میری نگاہ میں ہر دور کا شاعر اور ادیب، فلسفی اور فنکار سچ کی تلاش میں نکلا ہوا مسافر ہوتا ہے جو ظلم، جبر اور جھوٹ کے خلاف احتجاج کرتا ہے، جنگ کی آگ کو بجھاتا ہے اور محبت، امن اور آشتی کے خواب دکھاتا ہے۔ فنکاروں کا یہ قافلہ ازل سے چل رہا ہے اور ابد تک چلتا رہے گا۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ میں بھی اسی قافلے کا ایک مسافر ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری پسندیدہ غزلیں اور نظمیں آپ کو نہ صرف میرے سفر کی کہانی سنائیں گی بلکہ اپنے سچ کی تلاش کے سفر پر آمادہ بھی کریں گی۔

خالد سہیل

جولائی ۲۰۰٦ء

ورڈ تھراپسٹ Word Therapist

کلیم ظفر

عسکری صاحب نے اپنے کسی مضمون میں کہا تھا کہ مغرب کا شعور بنیادی طور پر تجزیاتی ہے اور مغربی ذہن چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھنے کا عادی ہے۔ جبکہ مشرقی ذہن امتزاجی ہے اور چیزوں کو ملا کر دیکھتا ہے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر خالد سہیل اُن لوگوں میں سے ہیں جو مشرق میں مغرب کا تجزیاتی ذہن لے کر پیدا ہوئے۔ انکی تمام شاعری دراصل اُن کے امتزاجی فکر کے ماحول سے تجزیاتی فکر تک، اُن کی ہجرت کی روداد ہے۔

اُن کی نظم 'جزیرہ' مختصراً اِس ہجرت کے اسباب اور منزل کے خواب پر روشنی ڈالتی ہے۔ نظم 'تلاش' اُس تگ ودو کا بیان ہے جو انہیں اُن کے اس جزیرے کی طرف بڑھتے ہوئے کرنی پڑ رہی ہے۔ خاصی مشکلات کے باوجود وہ پرُامید ہیں۔ یوں بھی طبیب کے لئے پُرامید ہونا لازم ہے۔

ایک طبیب ہونے کے ناطے وہ اپنے مریضِ خاص، اپنے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی جان گئے تھے کہ وہ کس مرض میں مبتلا ہے۔ تعصبات، فرسودہ روایات اور نام نہاد جمہوریت کے نام پر جس موزی نے اسے جکڑ رکھا ہے اُسکا نام لینا بھی ناحق جان دینے کے مترادف ہے۔

لیکن اِس صورتِ حال سے گھبرا کر وہ اپنے مریض کو کسی جھوٹے بہلاوے میں نہیں رکھتے بلکہ ورڈ تھراپی (word therapy) کی کوششوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔

میرے خیال میں انکی تمام شاعری، محاکے، مخاطبے اور دیگر تخلیقات دراصل اُن کی 'ورڈ تھراپی' کی کوششیں ہیں۔ جس کا رشتہ ان کے پروفیشن سے بالخصوص ان کے طریقہ علاج "Creative Psychotherapy" سے خاصا گہرا نظر آتا ہے۔

وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے قاری کا خیال بالکل اُسی طرح رکھتے ہیں جیسے اپنے مریض کا۔

شائد یہی وجہ ہے کہ خالد سہیل کی زبان عام فہم اور موضوعات بالکل سامنے کے ہیں۔

وہ معاشرے کی بوسیدہ عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کو زمانی و مکانی زاویہ نظر سے ملحقہ کسی آفاقیت میں گم نہیں ہونے دیتے۔ لمحاتی مشکلات کے حل کو صدیوں کے پھیروں میں تلاش نہیں کرتے۔ بلکہ جیسے جیسے زندگی اُن کا ان کاؤنٹر (Encounter) کرتی ہے وہ اس کو قلم بند کرتے چلے جاتے ہیں۔

ان کے ہاں غیب کے مضامین کا انتظار نہیں ہے۔ یوں ان کی شاعری میں ان دیکھی دُنیاؤں کے مضامین شاذ ہیں۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے باہر کی دُنیا پر خیال آرائی نہیں کرتے۔

ماہر نفسیات ہونے کے ناطے کسی داخلی یا نفسیاتی کشمکش کو اتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جب ان موضوعات کو اپنے تخلیقی تجربے میں شامل کرتے ہیں تو کسی الجھن یا پریشانی کا تاثر نہیں ملتا بلکہ سادہ اور سہل انداز میں ان مسائل کی تفہیم سامنے آتی ہے۔

مثال کے طور پر ان کی نظم ''روح کے زخم'' ڈیپریشن (Depression) کی کچھ حالتوں کا بیان لگتی ہے۔ مگر زور ڈیپریشن کی کیفیت پر نہیں بلکہ اُسکی تفہیم پر ہے۔

''روح کے زخم'' سے چند اشعار:

مرے خوابوں میں پت جھڑ کا یہ منظر
مرے باطن کا تازہ سانحہ ہے
ہے کتنی بزدلی جذبوں میں میرے
مرا ہر زخم حد سے بڑھ چکا ہے
مری انسانیت سے ناامیدی
مرا سب سے بھیانک المیہ ہے

خالد سہیل اپنے منصب اور اپنے مقصد کے ساتھ ساتھ اپنی فنی صلاحیتوں سے بھی باخبر ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ وہ اظہارِ فن کے لئے کسی اعلیٰ معیار کے حصول کی کوششوں میں اپنا توازن کھو کر اپنے فکری نظام سے الجھے نظر نہیں آتے۔ جبکہ اکثر کثیر الجہات لکھنے والوں کے ہاں انکے فکری نظام اور تخلیقی اظہار کے مابین ایک تضاد بھی دیکھنے میں آجاتا ہے۔

خالد سہیل کا تجزیاتی دماغ شائد اسی خدشے کے پیش نظر واضح طور پر استناجی یا "deduction"

مائل ہے۔

لیکن "deduction" کے منطقی طریقوں میں اکثر سہل فہمی کا اندیشہ رہتا ہے۔ خالد سہیل استقرائی طریقوں کی تہہ داری کے بوجھ سے اپنے قاری کو بچاتے ہوئے استناجی طریقے کی سہل فہمی کا خطرہ مول لیتے ہیں۔

اِن کی شاعری میں (Spontaneous Expression) یا فوری اظہار کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔ جو بظاہر سہل فہمی یا عجلت پسندی کا تاثر دیتی ہیں۔لیکن بباطن یہ اُس مابعدالطبیعاتی یا اساطیری سلیقہ اظہار کا رد ہیں، جو خالد سہیل کے خیال میں نئی دُنیا کے لئے موزوں نہیں۔ان کی نظم ''الفاظ اور ہم'' اُن کے شعری نظریے پر کچھ روشنی ڈالتی ہے۔

میرے خیال میں اس مختلف تخلیقی تجربے کا تخلیقی رمز اِسی عجلت پسندی یا سہل فہمی میں پنہاں ہے جو جدید دُنیا کی تیز رفتاری کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔جس کا قدم نئے تصورات اور نئے خیالات کی طرف ہے۔

کیونکہ اُردو ادب کا قاری بیشتر استقرائی منطق کے تحت امتزاجی زاویے نظر سے کام لیتا ہے، یوں اِسے اس تخلیقی رمز تک، پہنچنے میں دقت پیش آتی ہے۔ بالخصوص جب وہ اِس سے لطف اندوز بھی ہونا چاہتا ہو۔

یہاں مندرجہ بالا خیال کی تصدیق کے لئے میں خالد سہیل کی ایک نظم ''سنو مین'' اور منیب الرحمٰن صاحب کی نظم بعنوان ''برف کا آدمی'' کو ایک ساتھ پیش کرنا چاہوں گا۔

برف کا آدمی (منیب الرحمٰن)

برف گرتی ہے اور بچوں نے
برف کا آدمی بنایا ہے
ہو گیا ہے سفید ہر منظر
ہر طرف ایک سکوت چھایا ہے
وہ اکیلا کھڑا ہے میداں میں
غیر مانوس، اجنبی، گمنام

سنو مین (خالد سہیل)

شہر کے کھیلتے کودتے ننھے منے سے بچوں نے مل کر مجھے
برف کی اک پہاڑی سے کاٹا
تراشا
میرے ہاتھ پاؤں سجائے
مجھے برف کے چھوٹے چھوٹے سے گولوں سے مضبوط
کر کے
بڑے پیار سے

اس کی آنکھیں فضا میں تکتی ہیں
بے نوائی ہے اس کا طرزِ کلام
ایک جنسِ فضول اس کا وجود
زندگی اس کی بازیٔ طفلاں
بے تکا سا لباس پہنے ہوئے
سب کی خاطر مذاق کا ساماں
سردیٔ روزگار خواس کی
آئی بادِ شمال راس اُسے
شل ہوئی روح اس کی جاڑے سے
جیسے جاتی رہی ہو آس اسے
پھر بھی اس کو خیال آتا ہے
کاش اب یہ سماں بدل جائے
اس پہ خورشید کی نگاہ پڑے
اور اس کا بدن پگھل جائے

ایک چورا ہے پہ لا کر کھڑا کر دیا
مجھ سے کچھ دیر اٹھکیلیاں
دل لگی کا بہانہ بنیں
اور پھر جانے کیوں
شور غوغا ہوا
میرے سر، میرے پاؤں، میرے جسم کے
چند گولے بنے

اور گولوں کو بچوں نے معصوم ہاتھوں سے خود
ایک اک کر کے اُڑتی ہوا کے حوالے کیا

منیب الرحمٰن صاحب کی نظم کے آخری بند میں، جو اِس نظم کا خوبصورت کلائمکس بھی ہے، شاعر اور سنو مین کے ایک ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ نظم بیرونِ ذات ایک مشاہدے سے شروع ہو کر، باطن ذات کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے، ورامکاں پر قاری سے رخصت لیتی ہے۔ یوں نظم کا سفر بہت معنی خیز اور پراثر ہے۔ گویا بیرون ذات سے ایک شعلہ لپکا اور باطنِ ذات کو اجاگر کرتے ہوئے قاری کو ایک تجلّی بخش احساسِ فکر دے گیا۔

اس کے برعکس خالد سہیل 'سنو مین' "Snowman" کی بپتا سن رہے ہیں۔ یہاں سنو مین کا سامع باوجود احساسِ ہمدردی کے ایک خاص فاصلے کو قائم رکھتا ہے۔ یہاں نظم، بیرون ذات برپا کسی ہنگامے کی اطلاع سے صرف ایک خاص توجہ یا (Brain Storming) کی خواہاں ہے۔ یہاں 'سنو مین' اور اس کے

سامع کے تعلق میں جدید دُنیا کا وہی تصور نمایاں ہے جس کے تحت کسی کو اپنے رنگ میں رنگ لینا یا کسی کے رنگ میں رنگ جانا مقصود نہیں۔ جدید دُنیا اپنے رومانوی تصورات میں کسی فرق کو ختم کرنا نہیں چاہتی بلکہ وہ تمام امتیازات کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔

یوں خالد سہیل کے سنومین اور اس کے سامع کے درمیان جو فاصلہ نظر آتا ہے وہ کسی لاتعلقی کا مظہر نہیں۔ بلکہ جدید تصورحیات کے مطابق سنومین کی "space" کا خیال رکھنا ہے۔ بالالفاظ دیگر خیال رکھنا ہے کہ اظہار ہمدردی یا (Sense of Concern) تشخص یا (Sense of Identity) پر حاوی نہ ہوجائے۔ آمدٗ برسرِ مطلب اگر ہم اِس نئے فکری نظام کو نظر میں رکھیں تو خالد سہیل کی نظم سے بھی اُسی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں جیسے اور کسی مانوس سلیقۂ اظہار یا مانوس لہجے کی نظم سے ہوتے ہیں۔

یہ نیا تصور زندگی جس جدید دُنیا کے خواب سے منسلک ہے وہ مارشل میک لوہان McLohan کی دُنیا ہے۔ جو زندگی کی گاڑی کے عقبی شیشے یا (back view mirror) میں دیکھتے ہوئے نہیں چلانا چاہتی۔ اس کی آنکھیں سامنے کی طرف ہیں۔

خالد سہیل کا دماغ بھی اس جدید تصور زندگی سے پُر ہے اور بہتر آئندگاں کو ماضی پر ہر طرح کی فوقیت دیتا ہے۔ وہ ماضی کے گرفتاروں پر چوٹ کرتے ہیں۔

اپنے ماضی کے گرفتاروں کو
ہر عمل خون بہا لگتا ہے

یہ جدید فکری نظام اپنے سلیقہء اظہار میں نسبتاً کلائمکس سے کلائمکس کی طرف چلتا ہے۔ یہ "pathos" یا "anticlimax" سے گھبراتا ہے۔

"Sublime" کی تلاش میں یوں غوطہ زن نہیں ہونا چاہتا کہ پھر نکل نہ سکے یا ''ادھر ڈوبے اُدھر نکلے''۔ اس میں جذب وکیف کو اتنا دخل نہیں۔ یہ کسی ''کامک'' (Comic) یا طنز آمیزی (Satiric effect) کی تلاش میں بھی نہیں۔

حد تو یہ ہے کہ یہ کلائمکس سے کلائمکس کی طرف بڑھتے ہوئے کوئی انقلاب بھی برپا نہیں کرنا چاہتا۔ شائد جو انقلابی تاریخ اس کے ذہن میں ہے یہ اُسے بھی اپنا زیاں سمجھتا ہے۔

خالد سہیل کی شاعری بالخصوص ان کی نظمیں اُردو کے ایک ''کاؤنٹر کلچر'' ردِتہذیب (Counter

(Culture) یا ذیلی تہذیب (Sub culture) کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ (جہاں مسئلہ صرف بے خوف تفہیم ذات یا اظہار ذات کا ہے۔(Unfettered self realization or expression) یوں خالد سہیل کی شاعری میں 'بیٹ رائٹرز' (Beat writers) کی جھلک نظر آتی ہے۔ جو 1950 کے نصف سے 1960 کے اوائل تک امریکی ادب کی تاریخ میں متحرک رہے۔ اور 1970 تک کے کئی امریکی ناول نگاروں اور شعراء کو متاثر کیا۔

یہ لوگ استعمار اور سیاست کے ساتھ ساتھ دانشورانہ طرزِ اظہار کے بھی مخالف تھے اور سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی قدروں کے جبر سے آزادی چاہتے تھے۔ اپنے اظہار اور اپنی تفہیم کے لئے کسی بھی مروجہ طریقہ کار سے گریزاں تھے۔ 'بیٹ کا ادب بیشتر "Beaten downs" یا پسے ہوئے لوگوں سے متعلق تھا۔

سیاسی، سماجی، مذہبی اور جنسی دباؤ اکثر لوگوں کو ذہنی امراض میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور خالد سہیل ایسے لوگوں سے دن رات وابستہ رہتے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں 'بیٹ رائٹرز' کی طرح "Beaten downs" سے متعلق موضوعات خاصے نظر آتے ہیں اور یہ موضاعات اپنے برتاؤ میں خالد سہیل اور بیٹ رائٹرز کے درمیان قدر مشترک ہیں۔

خالد سہیل کا تخلیقی تجربہ اپنے فکری نظام اور سلیقہء اظہار میں خاصہ مختلف نوعیت کا ہے۔ یوں اس کے نتائج کی، فوری تکمیل کی خواہش مناسب نہیں اور کیونکہ یہ کسی بھی منظم روایت، عقیدے، نظریے اور تحریک سے ہٹ کر اپنی تفہیم چاہتا ہے اس لئے ہمیں اسی کے وضع کردہ اصولوں کو اپناتے ہوئے اس سے رشتہ استوار کرنا ہوگا۔ لیکن ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم تنقید میں قدری فیصلے کرنے کے عادی نہ ہوں۔

آخرش اس بات پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ خالد سہیل کا مختلف تخلیقی اظہار سنجیدہ مطالعہ کا متقاضی ہے۔

کلیم ظفر

8 اگست 2006ء

ن وقت اک بحرِ بیکراں خالدؔ
ہر ملاقات اک جزیرہ ہے

خوابوں کی کشتیاں

سمندر کے کنارے
ان گنت رنگوں کی سندر کشتیاں
اس سوچ میں ڈوبی ہوئی رہتی ہیں کب
ان کا مقدر جاگ جائے گا
وہ کب اتریں گی گہرے پانیوں میں
اور پہنچیں گی جزیروں تک
جزیرے
جن پہ خوابوں کی حسیں شہزادیاں صدیوں سے بستی ہیں

ستمبر ۲۰۰۱ء

الفاظ اور ہم

ہم نے چاہا تھا کبھی لفظوں کو
ان کے اصنام کی پوجا کی تھی
ان کی آوازوں سے خوش ہوتے تھے
ان کے مفہوم کو عظمت دی تھی

ایک اک حرف کو سو سو معنی
دے کے رسوا سرِ بازار کیا
دے کے ہر نقطے کو سو تفسیریں
ہم نے ہر صفحے کو بیکار کیا

ہم نے الفاظ کی عظمت چھینی
ہم نے الفاظ کی عزت لوٹی
ہم نے آوازوں کی مدہوشی میں
ان کے مفہوم کی عصمت لوٹی

ہم نے خود قتل کیا تھا ان کو
اور پھر آنسو بہائے خود ہی
اپنے مقتولوں کے پھر مردہ بدن
اپنے سینوں سے لگائے خود ہی

کیوں نہ ہم دل کی ہر بات کا اب
نئے پیرائے میں اظہار کریں
کیوں نہ جذبات و خیالات کا ہم
نئی پوشاک میں دیدار کریں

کچھ نئے لفظ تراشیں ہم بھی
نئی آوازوں میں کچھ روح بھریں
حرف و معنی کے نئے تاج محل
نئی بنیادوں پر تعمیر کریں

آؤ اک بار انہی لفظوں کو
ان کی کھوئی ہوئی عزت دیدیں
ان کی آوازیں مقدس کردیں
ان کے مفہوم کو حرمت بخشیں

۱۹۸۴ء

خوش بختی

مجھے زیست نے
اپنی آغوشِ نعمت میں شام و سحر
قطرہ قطرہ
محبت کے پستان سے
شیرِ اُلفت پلایا
مرے ذہن میں
رنگ و نکہت کی اِک کہکشاں کو سجایا
مرے قلب کو
کرب کی وادیوں میں
اُترنے کا رستہ بتایا
مجھے درد سہنا
مجھے پیار کرنا
مجھے شعر کہنا سکھایا

ستمبر 1985ء

غزلیں

غزل

سمندر میں ہوں لیکن تشنگی محسوس کرتا ہوں
میں اپنی زندگی میں کچھ کمی محسوس کرتا ہوں

کٹھن ہیں زیست کی راہیں پہ جب وہ ساتھ ہوتی ہے
تو پھر میں حبس میں بھی تازگی محسوس کرتا ہوں

میں اپنی ذات کی گہرائیوں میں جب اترتا ہوں
اندھیروں کے سفر میں روشنی محسوس کرتا ہوں

کبھی ہر عارضی کو دائمی میں سمجھا کرتا تھا
اور اب ہر دائمی کو عارضی محسوس کرتا ہوں

وہ کب کی جا چکی خالدؔ مگر میں اس کے بارے میں
کبھی سوچوں تو آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں

اگست ۱۹۹۶ء

غزل

کیا تم نے کبھی اپنا مقدر نہیں دیکھا
ہر گھر میں جو بستا ہے یہاں ڈر نہیں دیکھا

آئینہ ہر اک کمرے کا حیراں ہے کہ کیونکر
جس شخص نے دیکھا اسے مڑ کر نہیں دیکھا

بنیاد بھی کمزور ہے دیواریں شکستہ
اس دور میں انسان کا پیکر نہیں دیکھا

لفظوں کی عمارت پہ ہیں آسیب کے سائے
شاعر تو کئی دیکھے پیمبر نہیں دیکھا

اس درجہ روایات کی دیواریں اٹھائیں
نسلوں سے کسی شخص نے باہر نہیں دیکھا

راتوں کی تو کیا بات ہے اس شہر میں خالدؔ
برسوں سے کبھی دن بھی منور نہیں دیکھا

اپریل ۱۹۸۸ء

غزل

نئی کتاب، مدلّل جواب چاہیں گے
ہمارے بچے نیا اب نصاب چاہیں گے

روایتوں کے کھلونوں سے دِل نہ بہلے گا
بغاوتوں سے منور شباب چاہیں گے

دیارِ ہجر کی اس بے حِسی کے موسم میں
رفاقتوں کے معطّر گلاب چاہیں گے

شبِ سیاہ سے سُورج تراشنے والے
ہر ایک صبح نیا انقلاب چاہیں گے

حساب مانگیں گے اِک دن وہ لمحے لمحے کا
ہمارے عہد کا وہ احتساب چاہیں گے

نومبر ۱۹۸۵ء

غزل

ہمارے گھر کی ہر ایک چیز بے گھروں کی طرح
شریر بچوں کی بے ربط خواہشوں کی طرح

ہمارے عہد کے ذی ہوش خانداں سوچیں
وہ دلدلوں کی طرح ہیں کہ ساحلوں کی طرح

جدا ہوئے وہ گھروں سے تو یوں لگا سب کو
ٹپک پڑے ہوں وہ آنکھوں سے آنسوؤں کی طرح

بہت سے لوگ دلوں کے قریب تھے پر اب
بکھر گئے ہیں زمانے میں فاصلوں کی طرح

روایتوں کے اندھیروں میں ٹمٹماتے ہیں
جوان نسل کے افکار جگنوؤں کی طرح

زمانہ چھپتا ہے ان شاعروں سے اب خالد
جو شہرِ زیست میں آئے ہیں آئنوں کی طرح

اگست ۱۹۸۸ء

غزل

سجا سجا سا نئے موسموں کا چہرہ ہے
خزاں کا حسن بہاروں سے بڑھ کے نکھرا ہے

رفاقتوں کے سمندر میں شہر بستے ہیں
ہر ایک شخص محبت کا اک جزیرہ ہے

سفر نصیب ہوا جب سے شاہراہوں پر
تو فاصلوں کا بھی احساس مٹتا جاتا ہے

ہمارے دور کی تاریکیاں مٹانے کو
سحابِ درد سے خوشیوں کا چاند ابھرا ہے

اکتوبر ۱۹۸۵ء

غزل

ہم سے اگلی نسلوں نے یہ کیسا ورثہ پایا ہے
ہم نے اپنے بچوں کے بھی منہ کو خون لگایا ہے

ہم نے خود دیوار اٹھائی ہر رشتے میں نفرت کی
اور پھر ہم نے خود ہی اس سے اپنا سر ٹکرایا ہے

ہم نے ہر اک چوراہے پر، سچ کو خود سنگسار کیا
لیکن پھر بھی مجرم ہم نے غیروں کو ٹھہرایا ہے

ہمسایوں نے مل کے ہمارے گھر کو جس دن گھیر لیا
اس دن ہم نے سوچ سمجھ کر اپنے گھر کو جلایا ہے

خالدؔ جس کو شہر میں دیکھو ہم سے وہ ناراض ہوا
ہم نے جب سے لوگوں کو اک آئینہ دکھلایا ہے

اگست ۱۹۹۰ء

غزل

تری دستک سے بہتر بن گیا ہوں
میں اک دیوار تھا در بن گیا ہوں

مکاں ہی تھا میں جس دن سے بنا تھا
ترے آنے سے اب گھر بن گیا ہوں

تجھے پانے میں خود کو کھو دیا ہے
میں دریا تھا سمندر بن گیا ہوں

اگست ۱۹۹۷ء

غزل

تجھ سے سب کچھ کہہ کے بھی کچھ ان کہی رہ جائے گی
گفتگو اتنی بڑھے گی کچھ کمی رہ جائے گی

اپنے لفظوں کے سبھی تحفے تجھے دینے کے بعد
آخری سوغات میری خامشی رہ جائے گی

کشتیاں مضبوط سب بہہ جائیں گی سیلاب میں
کاغذی اک ناؤ میری ذات کی رہ جائے گی

حرص کے طوفان میں ڈھ جائیں گے سارے محل
شہر میں درویش کی اک جھونپڑی رہ جائے گی

چھوڑ کر مجھ کو چلے جائیں گے سارے آشنا
صبح دم بس ایک لڑکی اجنبی رہ جائے گی

رات بھر جلتا رہا ہوں میں سہیلؔ اس آس میں
میں تو بجھ جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی

اگست ۱۹۹۷ء

غزل

دشت میں پھول کھلانے میں بڑی دیر لگی
غیر کو اپنا بنانے میں بڑی دیر لگی

جسم کی بھوک مٹانا تو کوئی بات نہ تھی
روح کی پیاس بجھانے میں بڑی دیر لگی

عمر بھر کی ہے کمائی میرا رشتہ خود سے
ایسا رشتہ کہ نبھانے میں بڑی دیر لگی

عشق کے بوجھ سے دبتے رہے صدیوں ہم تم
بھاری پتھر تھا اٹھانے میں بڑی دیر لگی

رات یوں تھک کے وہ سوئی میرے پہلو میں سہیلؔ
صبح دم اس کو جگانے میں بڑی دیر لگی

ستمبر ۱۹۹۷ء

غزل

چاہت کا اک خواب ادھورا رہنے دو
تنہا ہوں میں مجھ کو تنہا رہنے دو

آوازوں کی محفل کے اک کونے میں
خاموشی کا دیپ بھی جلتا رہنے دو

ٹوٹ کے تجھ کو چاہنے کی اس کوشش میں
بکھرا ہوں گر، مجھ کو بکھرا رہنے دو

ہجرت کی منڈی کا سودا مت پوچھو
کیا کھویا اور کیا ہے پایا، رہنے دو

دانائی کا لنگر ہے یہ، مت چھیڑو
درویشوں کا شہر میں ڈیرا رہنے دو

تعبیروں کے دیس میں شاید جا پہنچوں
نیند میں خالدؔ مجھ کو چلتا، رہنے دو

اکتوبر ۱۹۹۷ء

غزل

کتنے دریا ہیں جو چڑھتے ہیں اتر جاتے ہیں
اپنے ہی شوق کی شدت سے وہ ڈر جاتے ہیں

اپنی ہر بوند میں اک قوسِ قزح پاتے ہیں
تیری محفل میں جو آتے ہیں سنور جاتے ہیں

مجھ سے ہر ماہ ترے خون کے آنسو پوچھیں
خواب کتنے ہیں جو اس کوکھ میں مر جاتے ہیں

بن کے خوشبو کسی آنگن کو معطر کر دیں
عشق جو ٹوٹ کے کرتے ہیں بکھر جاتے ہیں

جب سمندر کا سفر راس نہ آئے خالدؔ
کسی انجان جزیرے پر اتر جاتے ہیں

اکتوبر ۱۹۹۷ء

غزل

گفتگو اچھی لگی اور خامشی اچھی لگی
تیری قربت نے جو بخشی آگہی اچھی لگی

تتلیوں کو بھاگ کر چھونے کی یہ خواہش تری
تجھ میں جو معصوم بچی ہے چھپی اچھی لگی

چند گھنٹوں کی رفاقت میں یہ صدیوں کا سفر
وقت سے جو ماورا ہے دوستی اچھی لگی

زندگی ویسے تو ہر اک دور میں دلکش رہی
زندگی ہمراہ تیرے اور بھی اچھی لگی

تیرے چہرے کے تصور کا ہی یہ فیضان ہے
روح میں اتری جو شب بھر چاندنی اچھی لگی

تیری ہر اک یاد میرے من کی گلیوں میں سہیلؔ
شام ڈھلتے ہی بجاتی بانسری اچھی لگی

جنوری ۲۰۰۳ء

غزل

بڑھاپے میں دبے پاؤں جوانی لوٹ آئی ہے
کہ جیسے اب فسانے میں کہانی لوٹ آئی ہے

یہ کس کی چاہتوں کی شدتوں نے بند توڑے ہیں
کہ ٹھہرے پانیوں میں اک روانی لوٹ آئی ہے

دیارِ ہجر کے بے رنگ خوابوں کے اس آنگن میں
کسی کی یاد کی اک رت سہانی لوٹ آئی ہے

یہ کس کی قربتوں کا سحر ہے کہ بعد مدت کے
مرے اشعار میں جادو بیانی لوٹ آئی ہے

یہ کس دستِ حنائی نے ہے کی خالدؔ مسیحائی
کہ مردہ خواہشوں میں زندگانی لوٹ آئی ہے

نومبر ۱۹۹۸ء

غزل

'اپنی آگ میں جلتے رہنا کتنا مشکل ہے'
اپنے آپ سے لڑتے رہنا کتنا مشکل ہے

باہر باہر سب کی خاطر ہنسنا اور مسکانا
اندر اندر مرتے رہنا کتنا مشکل ہے

شبہ راہوں کی آسائش کو تیاگ کے ساری عمر
پگڈنڈی پہ چلتے رہنا کتنا مشکل ہے

صدیوں کی زنجیریں کھینچیں پیچھے کی جانب
پھر بھی آگے بڑھتے رہنا کتنا مشکل ہے

اپنے اک آدرش کی خاطر، ساری دنیا میں
خالدؔ ہجرت کرتے رہنا کتنا مشکل ہے

جنوری ۱۹۹۸ء

غزل

رفاقتوں میں ہیں پنہاں رقابتیں کیا کیا
محبتوں میں چھپی ہیں اذیتیں کیا کیا

جو کل تلک میری چاہت پہ ناز کرتی تھی
اسی کے لب پہ ہیں مجھ سے شکایتیں کیا کیا

جو بے خطر میرے خوابوں میں ڈوب جاتی تھی
اسی کی آنکھ میں ابھریں ندامتیں کیا کیا

اکتوبر ۲۰۰۰ء

غزل

کس قدر ہے عارضی، اس کا یقیں آتا نہیں
زندگی یہ پیار کی، اس کا یقیں آتا نہیں

کل تلک ہر راہ میں، ہر موڑ پر، ہر خواب میں
تو بھی میرے ساتھ تھی، اس کا یقیں آتا نہیں

زندگی کے بحر میں، وہ دور تک بہتی رہی
ایک ناؤ کاغذی، اس کا یقیں آتا نہیں

چاہتوں کی گیت جن ہونٹوں نے گائے رات دن
ان کو کیسی چپ لگی، اس کا یقیں آتا نہیں

جن نگاہوں میں ہوا کرتی تھی ہر سو روشنی
ان میں اب اک تیرگی، اس کا یقیں آتا نہیں

عشق کی چنگاریوں کو تو ہوا دیتے ہوئے
خود ہی آخر جل بجھی، اس کا یقیں آتا نہیں

جس تعلق پر ہمیں، حد سے زیادہ ناز تھا
اس پہ اب شرمندگی، اس کا یقیں آتا نہیں

عشق میں قربان سب کچھ کر دیا پھر بھی سہیل
رہ گئی تھی کچھ کمی، اس کا یقیں آتا نہیں

جون ۲۰۰۱ء

غزل

اپنے بیمار مسیحا کی عیادت کرنے
میں چلا آتا ہوں ہر شام عبادت کرنے

میں نے اک عمر گنوا دی تیرے در پر ورنہ
کون اس عہد میں جاتا ہے ریاضت کرنے

شہر میں جب بھی ملے سچ کے مخالف لاکھوں
میں اکیلا ہی چلا آیا حمایت کرنے

اب غلامی پہ ہیں نازاں جنہیں دعویٰ یہ تھا
وہ یہاں آئے ہیں قوموں کی امامت کرنے

جن روایات نے خوابوں کو مقید رکھا
ان روایات سے چلتے ہیں بغاوت کرنے

کیا زمانہ تھا کہ فنکار ولی ہوتے تھے
اب وہ ہر بزم میں جاتے ہیں سیاست کرنے

میں نے دیکھے ہیں کئی واعظ و پنڈت، خالدؔ
گھر سے جو روز نکلتے ہیں تجارت کرنے

جنوری ۲۰۰۱ء

غزل

وہ جس کسی کی بھی آغوشِ جاں کے بچے ہیں
نویدِ صبح ہیں سارے جہاں کے بچے ہیں

ہر ایک گھر کو جو حیرانیوں سے تکتے ہیں
وہ جس کی چھت ہی نہیں اس مکاں کے بچے ہیں

چمن کا اس سے بڑا المیہ بھی کیا ہوگا
جو پھول توڑتے ہیں باغباں کے بچے ہیں

ہمیں تو جتنے یہاں محتسب ملے سب کا
پتہ چلا کہ وہ پیرِ مغاں کے بچے ہیں

طلاق یافتہ ماں باپ کے حسیں بچے
کبھی تو باپ، کبھی اپنی ماں کے بچے ہیں

۱۹۸۵ء

غزل

شاخِ تنہائی پہ ڈر ڈر کے کھلے ہیں چپ ہیں
ہم کہ حالات کے دھاگے سے بندھے ہیں چپ ہیں

ہم نے شیشے کا مکاں مل کے بنایا لیکن
جب سے جانا ہے کہ پتھر کے بنے ہیں چپ ہیں

چارسو پھیلا نظر آتا ہے قربت کا سراب
ہم روایات کے صحرا میں کھڑے ہیں چپ ہیں

ہم کو ہر رشتے سے جنت کی تھی امید پر اب
خاندانوں کی جہنم میں جلے ہیں چپ ہیں

زیست کی آگ میں جل جل کے فغاں کرتے رہے
اور اس آگ میں کندن جو بنے ہیں چپ ہیں

دوست احباب بڑے رشک سے ملنے آئے
ہم جو گھر چھوڑ کے جنگل کو چلے ہیں چپ ہیں

فروری ۱۹۸۸ء

غزل

یخ زدہ شہر میں کیا کیا نہ دعائیں مانگیں
سرد سورج سے حرارت کی قبائیں مانگیں

بام و در بند ہیں ذہنوں میں گھٹن چھائی ہے
ہم نے ہمسایوں سے کچھ تازہ ہوائیں مانگیں

اپنے یاروں سے بھی اظہارِ تمنا کے لئے
المیہ یہ ہے کہ غیروں سے صدائیں مانگیں

اپنے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کی مجبوری سے
اجنبی جسموں سے قربت کی ردائیں مانگیں

لذت آزاری کے معبد کا مجاور ہوگا
جس نے محبوب خداؤں سے جفائیں مانگیں

اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے
اپنے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

اپنے بچپن کا کچھ اس درجہ اثر ہے خالد
نیکیاں کرتے رہے اور سزائیں مانگیں

فروری ۱۹۸۵ء

غزل

وہ ایک رات کہ جی بھر کے تجھ کو پیار کیا
تمام جسم کو بوسوں سے ہمکنار کیا

تری جوانی بھی اس رات کیا قیامت تھی
مری جوانی نے کچھ بھی نہ انتظار کیا

شرافتوں کے زمانے بھی لد گئے آخر
وہ چند گھڑیاں کہ برسوں تھا انتظار کیا

ترا سراپا، ترا قد، ترے لب و رخسار
میں اتنا خوش تھا، خوشی نے ہی اشکبار کیا

محبتوں کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا
حقیقتوں کو فسانوں سے ہمکنار کیا

تمام عمر تھا قاتل مرا مگر اس شب
ضمیر کو درِ عشرت پہ سنگسار کیا

نہ آدمی نہ خدا کا تھا مجھ کو ڈر اس شب
ثواب تھا کہ گنہ میں نے بار بار کیا

اپریل ۱۹۷۹ء

غزل

کسی کے پیار کی ہم بارشوں میں رہتے ہیں
یہ اور بات کہ کچے گھروں میں رہتے ہیں

بغاوتیں ہمیں احساس یہ دلاتی ہیں
روایتوں کی کڑی سرحدوں میں رہتے ہیں

نکلنا چاہیں تو اکثر نکل نہیں پاتے
حصارِ ذات کے ہم دائروں میں رہتے ہیں

ہمارے شعر کنول ہیں وگرنہ سچ یہ ہے
ہم اپنی روح کی اب دلدلوں میں رہتے ہیں

خدا کے نام پہ جو سب کو قتل کرتا ہے
کسی بزرگ کی ہم سازشوں میں رہتے ہیں

ہم اپنے پیار کو خالص نہ رکھ سکے خالدؔ
ہم اپنے عہد کی آلائشوں میں رہتے ہیں

اکتوبر ۲۰۰۲ء

غزل

اپنے خوابوں کا مکاں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں میں
تیرے قدموں کے نشاں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں میں

بے حسی کے دشت میں چلتا رہا ہوں عمر بھر
آگہی کا سائباں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں

نفرتوں کے آسماں کی وسعتوں میں دور تک
چاہتوں کی کہکشاں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں میں

جن کے من میں آگ تھی اب راکھ کا اک ڈھیر ہے
راکھ میں چنگاریاں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں میں

اب ہوا معلوم مجھ کو کس قدر انمول تھی
اپنی عمرِ رائگاں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں میں

روح کی سرگوشیاں دن رات خالدؔ سن سکوں
ہر طرف خاموشیاں اب ڈھونڈتا رہتا ہوں میں

ستمبر ۲۰۰۱ء

غزل

نہ کوئی آسمانوں سے اترتا ہے اشارہ اب
نہ کوئی ناخداؤں سے ہی ملتا ہے کنارا اب

سنی جتنی بھی ہم نے داستانیں سب وہ فرضی تھیں
نہ چھیڑو ان خداؤں کی کہانی تم خدارا اب

ہم اپنے خاندانوں کی جہنم میں جلے اتنے
کسی کے پیار کا ڈر ڈر کے لیتے ہیں سہارا اب

نجانے کب سے اپنی ذات کے دریا میں کھوئے تھے
بڑی مشکل سے دریا کا ملا ہے اک کنارا اب

نجانے کون تھا کب سے وہ مجھ میں چھپ کے بیٹھا تھا
بڑی اپنائیت سے جو ہوا ہے آشکارا اب

یہ کس نے دل کے دروازے پہ خالدؔ آج دستک دی
یہ کس نے روح کے غارِ حرا سے ہے پکارا اب

ستمبر ۲۰۰۱ء

غزل

جن رشتوں کو پیار سے سینچا' ان رشتوں سے خوشبو آئی
جن لوگوں نے نفرت بوئی' ان لوگوں نے نفرت پائی

جب جی چاہا آ جاتے ہیں' من کی باتیں کر جاتے ہیں
کچھ دن کا ہے جیون اپنا' کچھ دن کی ہے یہ تنہائی

آوازیں ہیں کنکر پتھر' خاموشی اک گہرا سمندر
نادانوں کو دیکھ کے اکثر' چپ ہی رہتی ہے دانائی

پل بھر میں جو رنجیدہ ہو' پل بھر میں جو خوش ہو جائے
کوئی کہے حساس بہت ہے' کوئی کہے ہے وہ سودائی

خالدؔ تجھ میں آخر کیا ہے؟ کیوں ہیں اتنے چاہنے والے
سب یہ جانیں تو پاگل ہے' سب یہ جانیں تو ہرجائی

اگست ۱۹۸۶ء

غزل

سمندروں کے سفر سے وہ ڈر گیا ہوگا
کسی جزیرے پہ شاید اتر گیا ہوگا

نگر نگر کے سفر سے وہ آج لوٹا ہے
بہت تھکا ہوا ہوگا وہ گھر گیا ہوگا

تمام عمر جو اک آہنی چٹان رہا
کسی کی بانہوں میں گھر کر بکھر گیا ہوگا

نصیب ہوگا کسی بے نوا مہاجر کا
بگڑ بگڑ کے جو آخر سنور گیا ہوگا

چلو سہیلؔ سفر پر نئے روانہ ہوں
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا ہوگا

ستمبر ۱۹۹۶ء

غزل

وہ منفرد سا جو رستہ دکھائی دیتا ہے
سہیلؔ اس پہ ہی چلتا دکھائی دیتا ہے

کسی کے چہرے کو جب بھی قریب سے دیکھا
اک اور چہرے میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے

کسے خبر کہ وہ کس لمحہ ٹوٹ جائے گا
وہ ایک رشتہ جو پختہ دکھائی دیتا ہے

وہ اپنی ذات میں اک انجمن رہا خالدؔ
جو سارے شہر میں تنہا دکھائی دیتا ہے

ستمبر ۱۹۹۵ء

غزل

یہ کیسی آزمائش کی گھڑی ہے
کہ ہم نے خودکشی کی ٹھان لی ہے

یہ کس نے کارخانوں کے دھوئیں کی
ہر اک چہرے پہ کالک سی ملی ہے

ہر اک موسم ہوا ہے بے ثمر کیوں
درختوں کی جوانی پوچھتی ہے

بھری تیزاب کی یہ کس نے بوتل
سنہرے بادلوں پہ پھینک دی ہے

یہ کس نے زہر گھولا پانیوں میں
کسے ان مچھلیوں سے دشمنی ہے

زمیں کی کوکھ میں مردہ ہیں بچے
نجانے بددعا کس کی لگی ہے

ہمارے عہد کی یہ آگہی کیوں
بنی خالدؔ جوازِ خودکشی ہے؟

جون ۱۹۹۵ء

غزل

سمندر کا کنارا اور تنہائی کا منظر ہے
زمیں پر میں اکیلا ہوں، فضا میں چاند بے گھر ہے

میں اس سے جب بھی ملتا ہوں، میں اس میں ڈوب جاتا ہوں
میں دریا ہوں محبت کا، وہ حیرت کا سمندر ہے

میں عہدِ خوف میں بستا ہوں اس سے بچ نہیں سکتا
کبھی وہ میرے باہر ہے، کبھی وہ میرے اندر ہے

میں اب چشمِ تصور سے، اسے بھی دیکھ سکتا ہوں
کبھی جو مجھ سے اوجھل تھا، وہ اب مجھ میں منور ہے

پرانے بھی مجھے خالدؔ، نئے منظر ہی لگتے ہیں
مری آنکھوں میں بچپن سے، تحیر ہی تحیر ہے

اگست ۲۰۰۵ء

غزل

صحراؤں میں ہم بادِ صبا ڈھونڈ رہے ہیں
کفار کے سینوں میں خدا ڈھونڈ رہے ہیں

تنہائی کی راتوں میں کسی جسم کی قربت
محرومی کے ہونٹوں پہ دعا ڈھونڈ رہے ہیں

فرعون کے اعمال میں انصاف کی خوشبو
جلاد کی آنکھوں میں حیا ڈھونڈ رہے ہیں

مجذوب کی باتوں میں معانی کے جواہر
بیمار کی جیبوں میں شفا ڈھونڈ رہے ہیں

کیا سادہ ہیں ہم لوگ کہ ان مردہ دلوں میں
نسلوں سے کوئی زندہ خدا ڈھونڈ رہے ہیں

جولائی ۱۹۸۸ء

غزل

سہیلؔ سر بلند ہم ندامتوں کے شہر میں
بغاوتیں ہیں سرخرو روایتوں کے شہر میں

ہمارے لفظ لفظ میں حقیقتوں کا عکس ہے
صداقتیں ہیں معتبر کہاوتوں کے شہر میں

رفاقتوں کی ریت کا ہمیں نے حق ادا کیا
ہمیں گھنے درخت ہیں تمازتوں کے شہر میں

ہمیں سے صبحِ علم کی جواں ہے آس آج تک
ہمیں جلے ہیں رات بھر جہالتوں کے شہر میں

ہمارے دم سے ہی سہیلؔ زندگی کی بازیاں
محبتوں نے جیت لیں عداوتوں کے شہر میں

فروری ۱۹۹۰ء

قطعات

گناہ

اسی نے چہرے کو تنویر میرے بخشی ہے
اسی نے چاند مری روح میں اتارا ہے
میں اعتماد کا پیکر بنا تو جان گیا
مرے گناہ نے کتنا مجھے سنوارا ہے

جنوری ۱۹۹۳ء

گراں گزرے

نہ کوئی مہرباں گزرے نہ کوئی رازداں گزرے
گلی کوچوں سے بیگانوں کا دن بھر کارواں گزرے
میں ایسے شہر میں رہتا ہوں سب بیزار ہیں خود سے
میں اپنے آپ کو چاہوں تو لوگوں کو گراں گزرے

جون ۱۹۹۴ء

آدرش

ہجرتوں کا خواب دیکھ اور خواب کی تعبیر دیکھ
اک مسافر راہ میں بیٹھا ہوا دلگیر دیکھ
گھر سے اک آدرش لے کر کب سے ہے نکلا ہوا
اب اسی آدرش کے پاؤں میں اک زنجیر دیکھ

مارچ ۲۰۰۶ء

کافری

اب اپنی ذات کی بھی آگہی سے خوف آتا ہے
اندھیروں کے ہیں عادی روشنی سے خوف آتا ہے
وراثت میں جنہیں دولت ملی ہے اندھے ایماں کی
انہیں خالدؔ ہماری کافری سے خوف آتا ہے

فروری ۲۰۰۱ء

انسان

نہ چمن میں ہے سکوں اور نہ ویرانوں میں
دربدر پھرتا ہے انسان بہاروں کے لئے
نہ خدا پر ہے بھروسہ نہ بتوں کا ہے یقیں
آج انسان ترستا ہے سہاروں کے لئے

اپریل 1977ء

کچھ لوگ

تنہائیوں میں گھر کے وہ حیران ہوگئے
محفل سے ہٹ گئے تو پریشان ہوگئے
مانندِ سایہ دار شجر معتبر جو تھے
دھرتی سے کٹ گئے تو وہ بے جان ہوگئے

۱۹۸۴ء

انسانیت کے رشتے

زبان اس کی تھی لیکن سوال اپنا تھا
وہ اجنبی تھا مگر ہم خیال اپنا تھا
عجیب حال ہوا جب بھی حال اس کا سُنا
زوال اس کا لگا یوں زوال اپنا تھا

جولائی ۱۹۸۵ء

عورت

اپنی تنہائی کے صحراؤں میں برسوں بھٹکا
اجنبی میرے لئے خود ہی مری ذات ہوئی
مدتوں بعد ترے رشتے سے خود کو جانا
تجھ کو پایا تو مری خود سے ملاقات ہوئی

۱۹۷۹ء

ناشتہ

سرسری بات کرنے آئی تھی
اک قیامت عجیب ڈھا کے گئی
شام کی چائے پینے آئی تھی
صبح کا ناشتہ وہ کھا کے گئی

۱۹۷۹ء

ساحل

میری کشتی کو یقیں ہے اِس کا
میرے دریا کے کئے ساحل ہیں
مجھ کو اکثر یہ گماں ہوتا ہے
میرے پہلو میں بہت سے دل ہیں

جنوری ۱۹۸۵ء

نظمیں

عورت سے رشتہ

میرے اِس دُنیا سے رشتے لاکھوں
ایک رشتہ میرا پھولوں سے بھی ہے
ایک خوابوں سے بھی ہے
ایک بچوں سے بھی بوڑھوں سے بھی ہے
ایک آہوں سے بھی نغموں سے بھی ہے
اور یہ سارے تعلق تیری نسبت سے ہی ہیں
یہ مرے شعر یہ نغمے تیری قربت سے ہی ہیں
تونے دُنیا سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر زیست کو تجھ سے ہی سمجھنا سیکھا
تو مرے ذہن میں مہکی کبھی پھولوں کی طرح
تو مری آنکھوں میں زندہ رہی خوابوں کی طرح
تو بسی زیست کی دوپہروں میں شاموں کی طرح
تیری قربت میری جنت تیری فرقت میرا پیغامِ اجل
تو مری ذات کی دلدل میں ابھرتی رہی بن بن کے کنول
تو نہ ہوتی تو مرا حال شکستہ ہوتا

کنجِ تنہائی کی دوزخ میں سلگتا رہتا
کبھی اپنوں کبھی بیگانوں سے لڑتا رہتا
تو نے مایوسی میں امید دلائی مجھ کو
شب تاریک میں لوری بھی سنائی مجھ کو
تیری آغوش سے ہمت بھی جرات پائی
تیرے پہلو سے محبت ہی محبت پائی
میرا آغاز ہے انجام ہے تو
میری محنت میرا انعام ہے تو
ایک رشتہ ہو تو میں اس سے تجھے یاد کروں
تجھ سے ہر گام پہ ہر موڑ پہ رشتے لاکھوں
تو مرا عکس بھی عکاس بھی آئینہ بھی
تو مری دوست بھی ہمراز بھی محبوبہ بھی

جنوری ۱۹۸۵ء

سرخ دائرہ

آج سترہ ہوئی

اور میں سوچ میں پڑ گئی

سینکڑوں وسوسے سانپ بن کر مرے ذہن کو آج ڈستے رہے

میں پریشان و حیران تھی

کیا میں مانوں اسے

یا نہ مانوں اسے

صبح سے کچھ عجب سی تذبذب کی تھی کیفیت

اور میں بہکی بہکی سی سوچوں میں گم

اپنے گھر سارا دن

سخت جھنجلائی پھرتی رہی

اور پھر

تیسرے پہر

کمرے میں داخل ہوئی

کانپتے ہاتھ سے

سالِ نو کے کلنڈر کا جب اک ورق

میں نے الٹا تو دیکھا
گزشتہ مہینے کی تیرہ ہی تاریخ کو
سرخ اک دائرہ تھا احاطہ کیے
لیکن اس مرتبہ
جانے کیا ہو گیا
اک عجب سی خلش
اور اک کپکپی خوف کی
میرے سارے بدن میں سرایت ہوئی
اور پھر میں تو سوچا ہی کی
آج سترہ ہوئی

۱۹۷۳ء

یہ مرا جسم ہے یہ مری زندگی

اک قیامت ہی گویا بپا ہوگئی
گھر کی ہر بات سرگوشیوں میں ڈھلی
ہولے ہولے سبھی نے خبر یہ سُنی
نوجوانی میں، میں حاملہ ہوگئی

ڈھیرے ڈھیرے ہر اک شخص مجھ کو بلاتا رہا
میری رنجیدہ حالت پہ وہ رحم کھاتا رہا
کوئی شادی کے فرسودہ نغمے سُناتا رہا
کوئی اسقاط کے مجھ کو نسخے بتاتا رہا
کوئی بے باپ بچوں کے قصے سناتا رہا
کوئی مجھ کو گناہوں سے ہردم ڈراتا رہا

میں یہ سب کچھ خموشی سے سُنتی رہی
چاہتی تھی مگر میں نہیں کہہ سکی
ساری خلقِ خدا کیا نہیں جانتی
یہ مرا جسم ہے یہ مری زندگی

مئی ۱۹۸۵ء

ماں بننے سے پہلے اور بعد

ماں بننے سے پہلے

یہ کس گنہ کی مشقتیں ہیں

جو درد زہ کی اذیتیں ہیں، ملامتوں کی صعوبتیں ہیں

تو میری دُنیا میں چند لمحوں کو آ گیا تھا

مرے سراپا کے تشنہ کامی کے پیکروں میں شراب امید و شہد لطف و کرم کے قطرے انڈھیل کر تو چلا گیا تھا

تلاش کرتی رہی میں تجھ کو

گلی گلی اور قریہ قریہ

جہاں بھی پہنچی نہ پایا کچھ بھی بجز زمانے کی تشنگی کے

ملامتوں جگ ہنسائیوں اور فرقتوں کے

تری جدائی میں ہجر یوسف کی قیس و فرہاد و ہیر رانجھا کی حسرتیں تھیں

صعوبتیں تھیں، مصیبتیں تھیں

میں جب بھی قلبِ فسردہ خاطر کے گوشے گوشے میں جھانکتی ہوں

میں بددعاؤں کا نفرتوں کا ابھرتا سیلاب دیکھتی ہوں

تجھے میں دن رات کوستی ہوں

فقط میں اتنا کہوں گی تجھ کو

مری جوانی کی دوزخوں کو کبھی بھی تم لوٹ کر نہ آنا

کبھی نہ آنا کبھی نہ آنا

ماں بننے کے بعد

مرا یہ بچہ ہے میری آنکھوں کا اک ستارا

مری یہ منزل مرا یہ ساحل مرا یہ پھل ہے

ہمارے رشتوں کی دلدلوں کا یہ اک کنول ہے

اسے میں دیکھوں تو میرے دل کو قرار آئے

اسے میں چوموں تو تیری قربت کی یاد آئے

اسے میں چوموں تو تیری قربت کی یاد آئے

اسے میں آغوشِ جاں میں لے لوں

تو یوں لگے جیسے تو ہی بانہوں میں آ گیا ہو

تو میرا محسن، تو میرا قاتل

ترے ہی دم سے ہوا یہ حاصل

جو تو نہ آتا تو ایک بنجر زمین رہتی

جو غم نہ سہتی تو کس طرح میں مسرتوں کا یہ پھول جنتی

ہمارے بچے کے پھول چہرے کی ہر ادا سے، جواں رہے گی، کہانی اپنی

اگر کبھی میری یاد آئے تو لوٹ آنا

کہ میری آغوش میں ابھی تک

مہک رہا ہے تمھارا سپنا

لیسبین Lesbian

عدالت: تو نے کیا قتل کیا ہے اس کو؟

عورت: (اس کے ہونٹوں پہ رہی ثبت خموشی کی مہر
اس کی آنکھوں میں تحیر کے سوا کچھ بھی نہ تھا)

عدالت: کیا نہیں تو نے سُنا؟

عورت: (دھیرے سے)

ہاں

میں نے ہی قتل کیا تھا اس کو

عدالت: اس نے کیا جرم کیا تھا کوئی؟

عورت: ہاں... نہیں... کچھ بھی نہیں

عدالت: یہ عدالت ہے یہاں
کچھ بھی چُھپ سکتا نہیں
جھوٹ چل سکتا نہیں
کُھل کے یاں بات تو کر
جو ترے دل میں ہے ہونٹوں پہ بھی لا
شرم نہ کر

عورت: دل کی گر بات بتاؤں
تو بس اتنی ہے کہ وہ مجھ کو بھلی لگتی تھی
اس کی قربت سے مرے دل کو سکوں ملتا تھا

لیسبین Lesbian

عدالت: تو نے کیا قتل کیا ہے اس کو؟

عورت: (اس کے ہونٹوں پہ رہی ثبت خموشی کی مہر
اس کی آنکھوں میں تحیر کے سوا کچھ بھی نہ تھا)

عدالت: کیا نہیں تو نے سنا؟

عورت: (دھیرے سے)
ہاں
میں نے ہی قتل کیا تھا اس کو

عدالت: اس نے کیا جرم کیا تھا کوئی؟

عورت: ہاں... نہیں... کچھ بھی نہیں

عدالت: یہ عدالت ہے یہاں
کچھ بھی چھپ سکتا نہیں
جھوٹ چل سکتا نہیں
کھل کے یاں بات تو کر
جو ترے دل میں ہے ہونٹوں پہ بھی لا
شرم نہ کر

عورت: دل کی گر بات بتاؤں
تو بس اتنی ہے کہ وہ مجھ کو بھلی لگتی تھی
اس کی قربت سے مرے دل کو سکوں ملتا تھا

اس کی زلفیں تھیں حسیں

اس کے رخسار حسیں

اس کی آنکھوں کی چمک

میرے خوابوں کی مکیں

مجھ سے مانوس تھی وہ

میری محبوبہ تھی وہ

وہ مرے پاس رہا کرتی تھی

اس پہ میں جان دیا کرتی تھی

میں اسے پیار کیا کرتی تھی

عدالت: تو نے کیا سوچ کے پھر اس کا گلا گھونٹا تھا؟

عورت: ایک دن اس نے کہا تھا

"میری شادی کر دو"

میں نے انکار کیا

اس نے اصرار کیا

میری جب بات نہ مانی اس نے

طیش اتنا مجھے آیا کہ گلا گھونٹ دیا

میری ہی گود میں جب

آخری سانس لیا تھا اس نے

میں پشیمان نہ تھی

میں پشیمان نہیں ہوں اب بھی

مجھ کو اتنا تھا یقیں

وہ کسی اور کی اب ہے بھی نہیں

عدالت: تیرا یہ جرم ہے سنگین بہت
ایک معصوم کو یوں قتل کیا ہے تو نے
اس کی پاداش میں اب موت ملے گی تجھ کو

عورت: (اس کے ہونٹوں پہ رہی ثبت خموشی کی مہر
اس کی آنکھوں میں تحیّر کے سوا کچھ بھی نہ تھا)

عدالت: اک رعایت تجھے دے سکتے ہیں ہم
ہو کوئی آخری خواہش تو بتا دے ہم کو

عورت: بس یہی ایک ہے خواہش میری
آخری بار اسے دیکھ لیں آنکھیں میری
اس کی تصویر دکھا دو مجھ کو
میرے ہونٹوں سے لگا دو اس کو
میں اسے پیار کیا کرتی تھی
اب بھی میں پیار اسے کرتی ہوں

۱۹۷۶ء

سوال

نہ جانے کتنے برسوں سے یہ دل کہتا رہا میرا
مرا شوہر، مرا مالک، مجازی تو خدا میرا

ترے ہر کام پہ ہر بات پہ میں ناز کرتی تھی
تری قربت میں جیتی تھی، تری فرقت میں مرتی تھی

تو میری زندگی کے آسماں کا اک ستارا تھا
مری تنہائیوں کا، درد و غم کا اک سہارا تھا

مگر پھر رفتہ رفتہ دل پہ کچھ مایوسیاں چھائیں
مرے انداز میری سوچ میں تبدیلیاں آئیں

مری ہر سوچ ہر اک فکر اب یہ مجھ سے کہتی ہے
تری عزت تری عظمت مری سب خود فریبی ہے

حقیقت وہ نہیں جس کو حقیقت میں سمجھتی تھی
سرابوں کو سمندر ہی نجانے کب سے کہتی تھی

مری بے عزتی کر کے تو کتنا فخر کرتا ہے
مجھے بے عقل، ناقص اور کیا کیا تو سمجھتا ہے

ترے افکار سے فرعونیت کی بو بھی آتی ہے
مری شرم و حیا اب خون کے آنسو بہاتی ہے

جو میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہے دیکھو
جو میرے دل کی باتیں ہیں تحمّل سے ذرا سُن لو

جو تیرے قلب کی گہرائیوں میں ہے سُنا مجھ کو
اگر تو مرد ہے تو آج سچ سچ یہ بتا مجھ کو

تری بیوی ہوں محبوبہ ہوں یا میں نوکرانی ہوں
ترے بچوں کی آیا ہوں کہ تیرے دل کی رانی ہوں

ترے کل کا سہارا ہوں یا ماضی کی سزا ہوں میں
شریکِ زندگی ہوں یا کہ تیری داشتہ ہوں میں

مئی ۱۹۸۴ء

ہاؤس ارسٹ (House Arrest)

صدیوں سے وہ قید ہیں گھر میں

ان کے جسموں کی ہر کونپل
محرومی کی ایک علامت
ان کے ذہنوں کی موسیقی
خاموشی سے محوِ ندامت
ان کی ہر اک رات سے پھوٹے
رفتہ رفتہ صبحِ بغاوت

صدیوں کی اس قید کا حاصل

گھر کے در کھل جائیں پھر بھی
گھر کو چھوڑتے شرماتی ہیں
گھر کے باہر تازہ ہوا میں
اڑنے سے وہ گھبراتی ہیں
دل کے اندیشوں سے خود بھی
جانے کیوں وہ ڈر جاتی ہیں

اکتوبر ۱۹۸۷ء

دو قتل

کل تک میں مسرور بہت تھی
میری آنکھیں روشن تھیں اور
میری کوکھ میں میرا بچہ
چلتا پھرتا باتیں کرتا
اپنی ماں کا دل بہلاتا
میرے خوابوں کا شہزادہ
میری ذات کا حصہ تھا وہ
لیکن آج میں خاموشی سے
کالے کپڑے پہنے سہمی
اپنی ذات پہ ماتم کرتی
چپکے چپکے آنسو بہاتی
اپنی کوکھ میں اپنے بچے
کی چھوٹی سے لاش اُٹھائے
زندہ ہوں پر قبر بنی ہوں
اُس نے ٹھوکر مار کے کل شب
میرے خواب اور میرے بچے
دونوں کو ہی قتل کیا ہے

نومبر ۱۹۸۷ء

سٹل برتھز (Still Births)

کتنے خواب
اور کتنے جذبے
دل کی کوکھ میں ڈر جاتے ہیں
کتنے بچے
پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں

ستمبر ۱۹۸۷ء

ایک عورت ہوں میں

زندگی

تنگ و تاریک سی کوٹھڑی ہے

کہ جس میں کوئی در نہیں

کوئی کھڑکی نہیں

روشنی اور ہوا کا جہاں

کوئی رستہ نہیں

اور میں

ایک کونے میں کب سے پڑی

یاس کی ایک تصویر ہوں

کتنی دلگیر ہوں

پابہ زنجیر ہوں

ایسا پودا ہوں میں

جس کی سب پتیاں

جس کی سب ٹہنیاں

ایک قطرہ نمی کی ترستی رہیں

ایک چڑیا ہوں میں

جس کے پر کاٹ کر

اس کا مالک کہے

تو ابھی تک اُڑی کیوں نہیں

فروری ۱۹۸۶ء

تکمیل

تجھے پایا
تجھے کھویا
تجھے کھو کر تجھے پایا
تجھے پا کر تجھے کھویا
تجھے پا کر تجھے کھونے سے میں
تکمیل کی ایسی حدوں کو چھو کے آئی ہوں
جنہیں پہلے کبھی سوچا نہ تھا میں نے
جنہیں پہلے کبھی سمجھا نہ تھا میں نے

جنوری ۲۰۰۳ء

سمندراور تشنگی

سمندر کے کنارے
چاندنی راتوں میں بیٹھا
ان حسیں شاموں کو اکثر یاد کرتا ہوں
وہ شامیں جب وہ میرے ساتھ ہوتی تھی
سمندر کی نہایت شوخ لہروں میں
اکٹھے ہم بھی پتھر پھینکتے تھے
اور پھر ہم کھلکھلا کر ہنس دیتے تھے

مگر اب چاندنی راتوں میں جب میں
سیر کو جاتا ہوں تنہائی کا کمبل اوڑھ لیتا ہوں
سمندر کے کنارے جب بھی گہری سوچ میں ڈوبوں
اداسی خامشی سے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے
مرے کندھے پہ ہمدردی سے اپنا ہاتھ رکھتی ہے
وہ کچھ کہتی نہیں لیکن مجھے معلوم ہے وہ
اس فضا اور میری آنکھوں کی نمی محسوس کرتی ہے
نمی جو مدتوں کے بعد بھی مجھ کو بہت مغموم رکھتی ہے

جنوری ۲۰۰۳ء

سنہرے خواب رستوں پر

مرا اس سے عجب بے نام رشتہ ہے
جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے
وہ میرے دل کی دنیا میں
نجانے کب سے رہتا ہے
اسے جب یاد کرتی ہوں
کتابیں اس کی پڑھتی ہوں
تو میرے من کی گلیوں میں
بہت سے چاہتوں کے پھول کھلتے ہیں

اسے دیکھا نہیں میں نے
مگر اپنائیت کا اک
عجب احساس ہوتا ہے
سنہرے خواب رستوں پر
وہ میرے ساتھ چلتا ہے
وہ ہے تو اجنبی لیکن
شناسا مجھ کو لگتا ہے
مراس سے عجب بے نام رشتہ ہے
جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے

جنوری ۲۰۰۳ء

بے نام رشتے

ہماری زندگانی میں
کئی بے نام رشتے ہیں
عقیدت اور چاہت کی
پرانی شاہراہوں سے نکل کر جو
کئی بے نام جذبوں کی
نئی پگڈنڈیوں پر جا پہنچتے ہیں
ہماری زندگانی میں
کئی بے نام رستے ہیں
روایت کے شناسا جگمگاتے شہر سے کترا کے چپکے سے
کسی انجان بستی کی
کئی بے نام گلیوں میں
کئی تاریک راہوں میں
اچانک جا نکلتے ہیں

ہماری زندگانی میں
کئی بے نام رستے ہیں
کئی بے نام رشتے ہیں

نومبر ۲۰۰۱ء

ایسی رات سے پہلے

تم نے مجھ کو برسوں سے
ٹوٹ کر جو چاہا ہے
صبح و شام پوجا ہے
رات دن سراہا ہے
اس کا ہی نتیجہ ہے
مجھ کو اب یہ دھڑکا ہے
یوں نہ ہو کہ میں اک شب
تیرے من کی حدت کی
تاب ہی نہ لا پاؤں
تیری گرم سانسوں سے
خود بخود پگھل جاؤں
یا شکستہ خوابوں کے
ایک ہار کی صورت
تیرے نرم بستر پر
ٹوٹ کر بکھر جاؤں

میرے ذہن میں جب بھی
یہ خیال آتا ہے
میرے من میں اک خواہش
کروٹیں بدلتی ہے

مجھ سے روز کہتی ہے

ایسی رات سے پہلے

کیوں نہ اپنی مرضی سے

ایک دن ترے گھر سے

خود ہی میں چلا جاؤں

اپنے سارے خوابوں کو

وقت کے سمندر میں

جا کے خود بہا آؤں

جولائی ۱۹۹۷ء

شہوت کا شہر

تنہائی کے تہہ خانے سے
ذات کے کندھوں پر وہ ہر شب
جسم کی اجلی لاشیں لے کر
قریہ قریہ گھوم رہی تھیں
میزوں پر وہ ناچ رہی تھیں

ہاتھوں میں کشکول اٹھائے
حسن کا وہ اک ڈھونگ رچائے
مردوں سے کچھ مانگ رہی تھیں

مردوں کی کمزوری لذت
لذت نے ہی آگے بڑھ کر
تعریفوں اور رحم کے ڈالر
ہمدردی کے کھوٹے سکے
کشکولوں میں ڈال دیے تھے

وقت کے نازک ہونٹوں پر جب
موسیقی کی تانیں ٹوٹیں
لاشوں کا پھر رقص رکا تھا
مرد گھروں کی جانب لپکے

اور پھر اپنی گھر والی کی
رات کو جب آغوش میں سوئے
اجلی اجلی لاشیں ساری
خاموشی سے خواب میں آئیں

اپریل ۱۹۸۷ء

وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا

زیست کی ساری شاہراہوں میں
ایک ہی سمت ایک ہی رخ ہے
منزلوں کی تلاش میں ہر روز
جو مسافر گھروں سے چلتے ہیں
تیر ہیں جو کماں سے چلتے ہیں
اور پھر لوٹ کر نہیں آتے

اے مرے دوست میرے گاؤں میں
جب بھی جانا تو میرے گھر جا کر
میرے ماں باپ سے بھی ملنا تم
اور پھر سارے رشتہ داروں سے
پیار و الفت سے دھیمے لہجے میں
میرے بارے میں یہ بتا آنا
اک مسافر جو گھر سے نکلا تھا
منزلوں کے قریب پہنچا ہے
اس کے تیور ہمیں بتاتے ہیں
اپنی منزل پہ جا کے دم لے گا
وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا

اور پھر یہ بھی اک حقیقت ہے
اس قدر دور جا چکا ہے وہ
آنا چاہے بھی اب تو آ نہ سکے

میری ماں کی بوڑھی آنکھیں

میری ماں کی بوڑھی آنکھیں
ان آنکھوں میں جب بھی جھانکا
خوابوں کے ویرانے دیکھے
ویرانے بھی ایسے جن میں
ہر اک حسرت خار بنی تھی
ہر اک خواہش سوکھی ٹہنی
برسوں کی معصوم امنگیں
پژمردہ مرجھائی کلیاں
امیدوں کے کنکر پتھر
چاروں جانب بکھرے پڑے تھے

میری ماں کی بوڑھی آنکھیں
ان آنکھوں میں جب بھی جھانکا
ماضی کے آسیب ہی دیکھے
نسلوں کی بیکار کی محنت
مردوں کی دن رات کی خدمت

میری ماں نے
سردی کی راتوں میں اکثر
ٹھنڈے پانی کے نلکے سے
کپڑے دھو کر ہاتھوں پر گٹے بھی ڈالے

گرمی کی اس دھوپ میں ہر دن
آگ جلا کر گھر والوں کی روٹی پکائی
اپنے چہرے کو جھلسایا
قربانی کی ریت نبھائی
لیکن برسوں کی اس
قربانی کا حاصل
آہیں آنسو
حسرت کے گمنام جزیرے
ایسے جزیرے جن پر تنہائی کا ڈیرا بسیرا

خواب ادھورا
بچوں سے اک اندھی محبت
میری ماں کی اندھی محبت
برسوں میرے پاؤں کی زنجیر بنی تھی

میں نے اس زنجیر کی خاطر
ہجرت کا اک زہر پیا تھا
ہجرت کا وہ زہر کہ جو اک
امرت بن کر شریانوں میں پھیل گیا تھا
میری ماں کی آنکھوں میں اب
محرومی کی دھول تو ہے پر
مایوسی کے خار نہیں ہیں
میری ماں نے

زیست کے ہر اک چوراہے پر
ہمت کے کچھ پھول کھلائے
چاہت کے کچھ گیت سنائے
اس ہمت نے اس چاہت نے
دو کلیوں کا روپ سنوارا
ایک کلی ہے عنبر بیٹی
جس کی خوشبو
قریہ قریہ پھیل گئی ہے
ایک کلی ہے شاعر بیٹا

دنیا بھر کے انسانوں کو پیار کا تحفہ
اپنی ماں کا نادر ورثہ

میری ماں اب خوش قسمت ہے
اس کی دونوں آنکھوں کے ان
خوابوں کے ویرانوں میں اب
خوشیوں کے دو پھول کھلے ہیں

جولائی ۱۹۸۸ء

یہ مری ہمسفر یہ ہوا

یہ مری ہمسفر یہ ہوا
میرے شانے کو نرمی سے تھپکا کے سرگوشیاں کر رہی ہے
چلو پھر چلو اے مرے ہمسفر
ایک بار اور رختِ سفر باندھ لو
آؤ مل کر پہاڑوں کے اوپر چڑھیں
وادیوں میں چلیں، بستیوں میں پھریں
آؤ ہم زندگی کے نئے موسموں سے ملیں
اور میں نے بڑے پیار سے یہ ہوا سے کہا
اے مری ہمسفر
تیری دعوت سنی تو مجھے جھرجھری آ گئی
تیری باتیں سنیں تو مجھے ذہنی دھچکے لگے
زخم جتنے تھے سارے ہرے ہو گئے

کیا تجھے یاد ہے اے ہوا
اپنا پچھلے برس کا سفر
میں ترے ساتھ ساتھ
کتنی مشرق کی گلیوں میں سڑکوں پہ پیدل چلا
کتنی مغرب کی میں شاہراہوں پہ گھوما پھرا
بستیوں میں رکا، ہوٹلوں میں بسیرا کیا
کتنے شہروں کے میں اجنبی، آشنا، خاندانوں سے ملتا رہا

کیسے کیسے مناظر نے روکا مجھے
کیسے کیسے مسائل نے بڑھ کر جھنجھوڑا مجھے
اور میں بھیگی آنکھیں لئے آگے بڑھتا رہا

کتنے بچے ملے
جو گھروں اور مکتب میں تازہ ہوا کو ترستے رہے
کتنے بوڑھے ملے
جن کی مجبوریوں کا مضحکہ اڑاتی رہیں ان کی تنہائیاں

اور کتنے جواں مجھ کو ایسے ملے
جنگ کے قافلوں میں جو بڑھتے رہے
لے کے اپنی ہتھیلی پہ اپنی ہی جاں
میں نے ایسی کئی عورتوں سے ملاقات کی
اپنے ماحول سے جو کہ دلگیر تھیں
بے بسی کی وہ تصویر تھیں
کتنے کالے ملے
نسل در نسل جو اپنے حق اور انصاف کی جستجو میں
صلیبوں پہ چڑھتے رہے
اور پھر میں نے دیکھے کئی خانداں
جن کی تسبیح کے سارے دانے بکھرتے رہے
مختصر یہ کہ میں جس طرف بھی گیا
ظلم کے بادلوں
بے بسی اور جہل و تعصب کی بڑھتی فضاؤں نے گھیرا مجھے

آج بھی اس سفر کے مناظر بھی
میرے خوابوں میں آ کر ڈرائیں مجھے

میری باتیں سنیں
تو ہوا مسکرا کر یہ کہنے لگی
اے مرے ہمسفر
کتنے سادہ ہو تم
کتنے بزدل ہو تم
ایک ہی عکس دیکھا تو شرما گئے
اک برس میں ہی گھبرا گئے
میں نے صدیوں سے ان راستوں، وادیوں، بستیوں میں بسیرا کیا
ہر برس میں نے ان آتے جاتے سبھی موسموں کو سہارا دیا
جب بھی جاتی ہوں ہیں
گنگناتی ہوں میں
پھول سے بچوں کو مسکرانا سکھاتی ہوں میں
ناتواں عورتوں کی بھی ہمت بندھاتی ہوں میں
اور بوڑھوں کی بے خواب راتوں میں جا کر انہیں
لوریاں بھی سناتی ہوں میں
جنگ کے بادلوں کو دباتی ہوں میں
ظلم کے قید خانوں میں جتنے مکیں ہیں انہیں

عدل کی گھنٹیاں بھی سناتی ہوں میں
الغرض جس طرف بھی میں جاتی ہوں اے ہمسفر

روشنی زندگی، آگہی، آشتی کے ترانے ہی گاتی ہوں میں

میں نے جب یہ ہوا کی کہانی سنی
میری ہمت بندھی
حوصلہ بھی بڑھا
اپنا رختِ سفر باندھ کر
پھر ہوا کے میں ہمراہ اڑنے لگا

دسمبر ۱۹۸۶ء

تلاش

میں چل رہا ہوں

میں ایک مدت سے چل رہا ہوں

میں زندگی کی حقیقتوں کی تلاش میں ہوں

میں منزلوں کے سراغ میں ہوں

میں روشنی کی تلاش میں ہوں

میں آشتی کا، سکونِ دل کا پتہ لگانا بھی چاہتا ہوں

اور آنسوؤں کو گلے لگا کر میں مسکرانا بھی چاہتا ہوں

میں ایک مدت سے چل رہا ہوں

میں جنگلوں میں بھی پھر چکا ہوں

سمندروں سے گزر چکا ہوں

میں دشت و دریا کا اک مسافر

میں اپنی دُنیا میں بڑھ رہا ہوں

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں

میں کتنا عاقل ہوں کتنا پاگل ہوں ایسی راہوں پہ چل رہا ہوں

جہاں نہ رہبر ہے اور نہ منزل

میں چلتے چلتے جو تھک گیا ہوں

نڈھال ہو کر میں گر گیا ہوں

مگر میں خود اُٹھ کے اپنے دل میں

جو جھانکتا ہوں

تو دیکھتا ہوں

مرے ارادے جوان اب تک

ہے میرے خوابوں میں آن اب تک
مرے خیالوں میں تاب اب تک
ہے میرے جذبوں میں شان اب تک
میں بڑھ رہا ہوں
میں مشکلوں سے گزر رہا ہوں
کسے خبر میری جستجوئیں بھی رنگ لائیں
کسے خبر میرے آنسوؤں یہ قافلے مسکراہٹوں کا لباس پہنیں
کسے خبر ہے میں زندگی کی حقیقتوں کو تلاش کرلوں
میں منزلوں کا سراغ پالوں
میں آشتی کا سکونِ دل کا پتہ لگالوں
اور اپنے پیاروں میں
ابنِ آدم کے بے قراروں میں
اپنی خوشیوں کو بانٹ دوں میں
میں زندگی کی رگوں کے اندر خوشی کے قطروں سے رنگ بھر دوں
میں چل رہا ہوں
میں ایک مدت سے چل رہا ہوں

۱۹۸۱ء

بدل گئیں

روایتیں بدل گئیں

ہمارے عہد کی حکایتیں، صداقتیں بدل گئیں

ہر ایک لب سلا ہوا

ہر ایک آنکھ رتجگوں کی داستاں

ہر ایک دل میں وسوسے

ہر ایک ذہن حیرتوں کا بحرِ بیکراں

نجانے کتنی حسرتیں جو دل کی دل میں رہ گئیں

نجانے کتنی چاہتیں جو آنسوؤں میں ڈھل گئیں

نجانے کتنی منزلیں جو راستوں میں کھو گئیں

گھروں کا اب یہ حال ہے

بزرگ اپنی داستاں سنا سنا کے تھک گئے

جوان اپنی شہوتوں کی مستیوں میں کھو گئے

نجانے کتنی عورتوں کی کہکشاں بکھر گئی

نجانے کتنے طفل ہیں

گھروں کو اپنے چھوڑ کر

گلی گلی سڑک سڑک

اماں کی جو تلاش میں

کسی جہانِ بے اماں میں کھو گئے

زمین بانجھ ہو گئی

فضا دھواں دھواں ہوئی

سمندروں کے پانیوں میں زہر ہے گھلا ہوا

یہاں ہے کون جو نہیں ہے جانتا

ہر ایک دن زمین پر

بنا ہے اب تو سانحہ

مگر یہ کیا کہ آج بھی ہیں چند ایسے سر پھرے

ہر ایک شاہراہ پر

جو اپنی دھن میں ناچتے

تلاش کر رہے ہیں وہ پرانی چاہتیں، محبتیں، بشارتیں

ازل سے جن کی کوکھ سے

مسرتوں کی آس تھی

مگر ہمارے عہد کا یہ حادثہ

کہ ان کی ساری چاہتوں، محبتوں، بشارتوں

نے خون ہے اگل دیا

وہ خون جس کو دیکھ کر

سروں کو اپنے تھام کر ڈرے ڈرے

ہر ایک اجنبی، ہر ایک آشنا سے پوچھنے لگے کہ کیوں

بدل گئیں

روایتیں بدل گئیں

ہمارے عہد کی حکایتیں، صداقتیں بدل گئیں

جون ۱۹۹۴ء

خواب نگر

میرا من اک خواب نگر ہے
میرے من کی گلیوں، بازاروں اور چوراہوں میں
لفظوں، رنگوں اور خوشبوؤں کی
ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہتی ہے

میرا من اک خواب نگر ہے
میرے من میں
چاہ کے چشمے
امن کی نہریں
آس کے دریا
پیار سمندر
ہر سو بہتے رہتے ہیں
جن میں نہا کر
اپنے بھی بیگانے بھی
دانائی کی دھوپ میں لیٹے
سحر زدہ سے رہتے ہیں

میرا من اک خواب نگر ہے
میرے من میں

درویشوں کا ڈیرا بھی ہے

اس ڈیرے پر

شاعر، صوفی، پاپی، دانا، سب آتے ہیں

کچھ سپنے وہ لے جاتے ہیں

کچھ سپنے وہ دے جاتے ہیں

ان سپنوں کی دھرتی سے جب

غزلوں، نظموں، گیتوں کے کچھ

پھول کھلیں تو برسوں پھر وہ

خواب نگر کو مہکاتے ہیں

میرا من اک خواب نگر ہے

میرے من کی گلیوں، بازاروں اور چوراہوں پر

لفظوں، رنگوں اور خوشبوؤں کی

ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہتی ہے

نومبر ۱۹۹۱ء

سنومین... Snowman

شہر کے کھیلتے کودتے ننھے منے سے بچوں نے مل کر مجھے
برف کی اک پہاڑی سے کاٹا
تراشا
مرے ہاتھ پاؤں سجائے
مجھے برف کے چھوٹے چھوٹے سے گولوں سے مضبوط کر کے
بڑے پیار سے
ایک چوراہے پہ لا کر کھڑا کر دیا
مجھ سے کچھ دیر اٹھکیلیاں
دل لگی کا بہانہ بنیں

اور پھر
جانے کیوں
چند بچوں کے ابرو اٹھے
شور و غوغا ہوا
میرے سر میرے پاؤں مرے جسم کے
چند گولے بنے
اور گولوں کو بچوں نے معصوم ہاتھوں سے خود
ایک اک کر کے اڑتی ہوا کے حوالے کیا

جنوری ۱۹۸۸ء

ٹوٹا ہوا آدمی

وہ زندگی کی حرارتوں سے
وہ اپنے گھر کی بشارتوں سے
وہ دوستوں کی رفاقتوں سے
وہ اپنی جاں کی صداقتوں سے

نجانے کب سے بچھڑ گیا ہے
وہ ٹوٹ کر اب بکھر گیا ہے

دسمبر ۱۹۸۶ء

Christmas Dinner... کرسمس ڈنر

اک حسیں شام تھی کرسمس کی
شہر میں ہر طرف چراغاں تھا
رنگ ونکہت کی ایک بارش تھی
ایسی رنگینیوں کے جھرمٹ میں
چندافراداک گھرانے کے
کچھ تحائف کے ساتھ میز کے گرد
منتظر تھے کسی کی آمد کے

اور پھر خانداں کا بوڑھا شخص
لڑکھراتے ہوئے سہارے سے
اپنے بچوں کے پاس آپہنچا
اس نے لیکن عجب حقارت سے
سب تحائف کوروندڈالا تھا

سرخیِ مے سے جلتی آنکھوں سے
چندآنسواُمڈ کے آئے تھے
اس نے پھر لڑکھڑاتے لفظوں سے
دل میں جو بات تھی وہ کہہ ڈالی

میرے بچو! مرے جگر گوشو!

سال بھر مجھ سے دور رہتے ہو

پھر کرسمس پہ تحفے دیتے ہو

جانے کن بستیوں کے باسی ہو

کیسی خوش فہمیوں میں زندہ ہو

میرا جس شہر میں بسیرا ہے

اس میں تنہائیوں کا ڈیرا ہے

ہر نفس پر یہ ہو رہا ہے عیاں

خانداں کب کے مر چکے ہیں یہاں

خاندانوں کے پھر بھی ماتم کا

کس قدر اہتمام ہوتا ہے

ان کی مرقد پہ اب چراغاں بھی

سال میں ایک شام ہوتا ہے

یہ وہی شام ہے کرسمس کی

میں کہ اس شام کی اذیت کو

گھول کر پی گیا شرابوں میں

تم خدا کے لئے نہ آیا کرو

میری بے کل اداس شاموں میں

دسمبر ۱۹۸۵ء

بادل

بہت آوارہ پھرتا ہوں
ہراک رستے پہ چل پڑتا ہوں
اپنی منزلوں سے بے خبر رہتا ہوں
مجھ کو آسمانوں کا کوئی ہمراز مل جائے
تو اس کا ہمسفر بن کر
جہاں کی سیر کرتا ہوں
بہت بدنام ہوں
ہر سو مرا ہرجائی پن مشہور ہے لیکن
جہاں رکتا ہوں کتنے دھوپ کے مارے مرے سائے میں آتے ہیں
کبھی ہنس دوں تو بارش سے بہت سی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں
کبھی مہتاب خود آغوش میں آئے تو تارے رشک سے آنکھیں جھپکتے ہیں
بہت آوارہ ہوں لیکن
مری آزادیاں مجھ کو بہت محبوب رہتی ہیں۔

جنوری ۱۹۸۸ء

جنگلی پھول

کسی کے کوٹ کے کالر میں
بالوں میں
نہ گلدانوں میں سجتا ہوں
کسی کے باغ میں
دفتر کی میزوں پر
نہ تہواروں میں کھلتا ہوں
نہ میری مسکراہٹ ہی سرِ بازار بکتی ہے
نہ میری کاغذی پھولوں سے ہر دم کی رفاقت ہے
مری ہر مسکراہٹ میری آزادی کا مظہر ہے
مرا ماحول فطرت کے تبسم سے معطر ہے
میں انساں کی منافق زندگی سے دور رہتا ہوں
میں جنگل میں مہکتا ہوں
میں جنگل میں ہوں مرجھاتا
میں جنگل کا ہوں شہزادہ

جنوری ۱۹۸۸ء

یروشلم

ابراہیم کا شہر کہ جس کی
بنیادوں کو محکم کرنے
امن نے مٹی، عشق نے گارا
قُربانی نے پتھر ڈالے

ابراہیم کا شہر کہ جس کی
دیواروں کو اونچا کرنے
مُوسیٰ، عیسیٰ اور محمدؐ
اپنی اپنی امت لائے

ابراہیم کا شہر کہ جس کے
میناروں کا حسن بڑھانے
فنکاروں نے برسوں مل کر
کیسے کیسے نقش بنائے

آج جو میں اُس شہر سے گزرا
ایک عجب ہی منظر دیکھا
بنیادوں کو خون اگلتے
دیواروں کو گریہ کرتے
میناروں کو آہیں بھرتے
ہمسایوں کو لڑتے دیکھا
انسانوں کو مرتے دیکھا

جون ۱۹۸۶ء

اسرائیل

نفرت بھی عجب اور محبت بھی عجب تھی
اس شہر میں قربت کی روایت بھی عجب تھی

دیواریں تھیں ہمراز مگر دل میں خلیجیں
ہمسایوں کی آپس میں رقابت بھی عجب تھی

اک باپ کی اولاد مگر خون کے پیاسے
دشمن تھے مگر ان میں شباہت بھی عجب تھی

خاموشی کا ہر لمحہ وہاں چیخ رہا تھا
آوازوں کی بستی میں بغاوت بھی عجب تھی

معصوم جبینوں پہ ملے خون کے چھینٹے
اور اس پہ ستم خون کی رنگت بھی عجب تھی

جو شخص ملا کانچ کا پیکر لگا مجھ کو
اور کانچ کی پتھر سے رفاقت بھی عجب تھی

ہر نسل نئی نسل کو دیتی رہی ہتھیار
اس شہر میں خالدؔ یہ وراثت بھی عجب تھی

جولائی ۱۹۸۶ء

عالمی سیاست

جبینِ عدل کی رنگت جو خونچکاں ٹھہری
ہمارے عہد کی ہر آہ بے زباں ٹھہری

نجانے کون کسی لمحہ قتل ہو جائے
حیات اہلِ سیاست سے بدگماں ٹھہری

سلامتی کے خداؤں نے خون تھوکا ہے
رفاقتوں کی روایت دھواں دھواں ٹھہری

ڈھکے چھپے جو تضادات تھے ابھر آئے
ہر ایک جنگ وفاؤں کا امتحاں ٹھہری

نہ کوئی شہر نہ دیہات بچ سکا اس سے
چلی جو ظلم کی آندھی تو پھر کہاں ٹھہری

سہیؔل چاروں طرف بے بسی کے طوفاں ہیں
صدا عوام کی ابھری تو بادباں ٹھہری

اپریل ۱۹۸۶ء

جنوبی افریقہ (۱)

اس سے بڑھ کر کبھی حالات نہ ابتر دیکھے
شہرِ خوش رنگ کے معمار ہی بے گھر دیکھے

ہم نے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جب بھی جھانکا
کہیں آسیب، کہیں خوف، کہیں ڈر دیکھے

جن کی محنت نے سیہ کانوں سے ہیرے کاٹے
ان کے بچوں نے سدا کھیل میں کنکر دیکھے

ہر مسافر یہاں پیتا رہا آنسو اپنے
اور گزرگاہوں پہ روتے ہوئے پتھر دیکھے

شہر کی آنکھوں میں اب خون اُتر آیا ہے
ہم نے حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے

جنوری ۱۹۸۶ء

جنوبی افریقہ (۲)

کالے جسموں کی ریاضت کا مآل اچھا ہے
حکمراں اب نظر آتے ہیں نڈھال اچھا ہے

خود کشی کرنے کو تیار ہیں لاکھوں انساں
کون کہتا ہے کہ اس شہر کا حال اچھا ہے

جس طرف جاتے ہیں دیواریں ہی دیواریں ہیں
شہر کا شہر گرا دو یہ خیال اچھا ہے

کتنے جذبات دبائے گئے صدیوں سے یہاں
اب اگر خون میں آیا ہے ابال اچھا ہے

اونچے میناروں سے دے جاکے اذانِ جمہور
ہر سیہ شخص جو بن جائے بلال اچھا ہے

جب بھی بازار میں بڑھ جائے گا انسان کا نرخ
بر ملا ہم بھی کہیں گے کہ وہ سال اچھا ہے

عہدِ انصاف کی امید پہ زندہ ہے سہیلؔ
عہدِ فرسودہ پہ آ جائے زوال اچھا ہے

فروری ۱۹۸۶ء

نیویارک

رات آسیب کا سایہ ہے کہ ڈر جاتے ہیں
خوف ہر موڑ پہ رقصاں ہے جدھر جاتے ہیں

شام آلودۂ خوں ہے کہ بھرے شہر کے بیچ
کتنے خنجر ہیں جو سینوں میں اتر جاتے ہیں

سہ پہر اتنی ہراساں کہ گلی کوچوں میں
لوگ خاموشی سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں

دوپہر جبر سے مسموم چتا ہے جس میں
بے زباں بھوک سے بے وقت ہی مرجاتے ہیں

صبح بیمار کے چہرے کی طرح زرد سدا
جس میں معصوموں کے شیرازے بکھر جاتے ہیں

رات دن اتنے بھیانک ہیں کہ اکثر خالدؔ
آدھے رستے سے ہی ہم لوٹ کے گھر جاتے ہیں

اکتوبر ۱۹۸۷ء

عراق

عراقی قوم کے معصوم بچے اپنی آنکھوں سے
دیارِ غیر سے آئے جہازوں اور توپوں کے
بموں کی زد میں آئے کوچہ و بازار سے اٹھتے
دھویں کے بادلوں کو دیکھ کر ماں باپ سے پوچھیں
ہمارے امن کے خوابوں میں کس نے زہر گھولا ہے
ہمیں آزاد کرنے کون سے جلاد آئے ہیں

اپریل ۲۰۰۳ء

تشدد اور امن کے پجاری

تشدد کے پجاری

گھر سے وہ خون بہانے کے لئے نکلے ہیں
شہر کو آگ لگانے کے لئے نکلے ہیں
کوئی افواہ اڑانے کے لئے نکلے ہیں
دہر میں خوف بڑھانے کے لئے نکلے ہیں
اتنی بے رنگ ہوئی زیست کہ اس میں ہر شب
خون کا رنگ ملانے کے لئے نکلے ہیں

امن کے پجاری

پیار کا گیت سنانے کے لئے نکلے ہیں
عشق کی ریت نبھانے کے لئے نکلے ہیں
نسل در نسل جو بڑھتی رہی دہشت اس کو
جتنا ممکن ہے گھٹانے کے لئے نکلے ہیں
امن سے اتنی محبت ہے کہ دشمن سے بھی
بڑھ کے وہ ہاتھ ملانے کے لئے نکلے ہیں

اگست ۲۰۰۵ء

امن کی دیوی

اِدھر مغرب کے دہشت گرد
جمہوری روایت اور آزادی کی توپوں سے
ہزاروں بے گنہ بچوں
کا ہر دن خون کرتے ہیں

اُدھر مشرق کے دہشت گرد
مذہب اور خدا کے نام پر ہر شب
بموں سے فوجیوں کی گاڑیاں اور سر اڑاتے ہیں

وہ مشرق ہو کہ مغرب ہو
بچاری امن کی دیوی
عجب وحشت میں رہتی ہے
صفِ ماتم بچھا
ہابیل اور قابیل کی معصوم لاشوں پر
تڑپتی اور سسکتی، خون کے آنسو بہاتی ہے
وہ کب سے آشتی اور احترامِ آدمیت کے جنازوں پر
مسلسل بین کرتی ہے، مسلسل بین کرتی ہے، مسلسل بین کرتی ہے

فروری ۲۰۰۵ء

امریکہ کی خارجہ پالیسی

وہ جس سے
رات کو ہمبستری کرتی ہے
صبح ہوتے ہی
اُسے قتل کروادیتی ہے
پھر بھی
اُس کے عاشقوں کی فہرست طویل ہے

بوڑھا فوجی

زمانہ اس کو بیتا ہے

میں فوجی تھا

میں اپنے دیس کا ادنیٰ سا خادم تھا

میں اپنے ملک و مذہب کا بہت مخلص سپاہی تھا

بہت سی جنگوں میں، میں جان کی بازی لگا کر لوٹ آیا تھا

بہت سے معرکوں میں موت کو بھی چھو کے آیا تھا

مجھے ہر جنگ میں ہر معرکے میں فخر تھا اس کا

حقیقت کا میں پیرو تھا

صداقت کا مبلغ تھا

محبت میرا مذہب تھا

مجاہد بن کے زندہ تھا

شہادت میرا مقصد تھا

مگر پھر رفتہ رفتہ مجھ کو اپنے ساتھیوں کے حکمرانوں کے

چھپے منصوبوں اور ہر رازِ در پردہ سے آگاہی ہوئی حاصل

ہوا معلوم یہ مجھ کو

صداقت تھی کہاں کشور کشائی کو جنوں تھا اک

حقیقت جو بظاہر تھی سراپا اک تعصب تھا

محبت نام تھا ___ فرعونیت تھی اس کی پردے میں

مری اس آگہی کے بعد مجھ پر اک قیامت ہی تو گزری تھی
مرے دل میں سوالوں کا عجب طوفان اُٹھتا تھا
میں خود سے پوچھتا یہ تھا کہ میری اصلیت کیا ہے؟
سپاہی ہوں کہ ظالم ہوں؟
مجاہد ہوں کہ قاتل ہوں؟
اسی احساس کا اس سوچ کا اب نتیجہ ہے
کہ اپنی فوج کو چھوڑے ہوئے عرصہ ہوا لیکن
مرا ماضی مرے کاندھوں پہ بھاری بوجھ ہے اب تک

اپریل ۱۹۸۴ء

کلونیلزم Colonialism

ہم نے اپنے آقاؤں سے
نفرت کی ہے
لیکن ان کے نقشِ قدم پر
سر بھی جھکایا
ان کے منہ پر تھوکا لیکن
طرزِ عمل کو
دل سے لگایا
ہم بھی کتنے سادہ دل ہیں

نومبر ۱۹۸۷ء

پاکستان (مارشل لا کے دَور میں)

حدیثِ کربِ نہاں اب کرے بیاں کوئی
سنائے جبرِ مسلسل کی داستاں کوئی

میں کس سے شہرِ تمنا کا راستہ پوچھوں
کہ اس ہجوم میں پاؤں نہ ہم زباں کوئی

کسے ہے شک کہ وہ گھٹ گھٹ کر مر نہ جائیں گے
جو اپنے گھر میں بھی پائیں نہ رازداں کوئی

تمام شہر کو آزادیوں کی خبریں دے
قفس قفس پہ رقم کرکے آشیاں کوئی

جو بام و در پہ منقش ہوا ہے ذہنوں کے
وہ شہرِ درد کا شاید ہے بے نشاں کوئی

ہمارے بچوں کی سوچوں پہ کب سے پہرے ہیں
کہاں سے آئے گا آزاد نوجواں کوئی

شبِ حیات بڑی مختصر رہی خالدؔ
نہ ماہتاب ہی دیکھے نہ کہکشاں کوئی

جنوری ۱۹۸۵ء

قصہ خوانی بازار

عزیز دوستو اور مسافرو!

ہر رات

جب تاریکی اپنا دامن پھیلا دیتی ہے

بچے سو جاتے ہیں

پرندے اپنے گھونسلوں میں چھپ جاتے ہیں

اور

سورج کسی اور دُنیا کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے

تب تم لوگ یہاں آتے ہو

ایک آتشدان کے گرد

ایک دائرے میں بیٹھتے ہو

اپنی چینکوں سے اپنی پیالیوں میں

سبز چائے انڈیلتے ہو

اور مجھ سے ایک نئی کہانی سنانے کی فرمائش کرتے ہو

اور میں

جسے کہانیاں سنانے کا شوق ہے

تمہیں نئی کہانیاں سناتا ہوں

وہ کہانیاں

جو میں نے لڑکپن میں کتابوں میں پڑھی تھیں

وہ کہانیاں

جو میں نے جوانی میں دُنیا کی سیر کے دوران اوروں سے سُنی تھیں

اور وہ کہانیاں جو میری نانی اماں نے مجھے بچپن میں سُنائی تھیں

وہ کہانیاں جو میری نانی اماں کو

اُن کی نانی اماں نے سُنائی تھیں

یہ کہانیاں

ہمارے آبا و اجداد کی دانائی

ہمارے لوک ورثہ کی طرح

نسل در نسل

سینہ بہ سینہ

چلتی آئی ہیں

یہ کہانیاں ہمارے بزرگوں کے عہد کی ہیں

جب نہ کتابیں ہوتی تھیں نہ ریڈیو

نہ ٹیلی ویژن ہوتے تھے نہ انٹرنیٹ

میں ایک پرانی کہانی

ہر رات آپ کو سناتا ہوں

اور پھر اس پرانی کہانی سے

ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے

اور کہانیوں کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے

یہ دل پذیر کہانیاں

زندگی کی کوکھ سے جنم لیتی رہی ہیں

یہ دلچسپ کہانیاں

مردوں کی بھی ہیں عورتوں کی بھی

بچوں کی بھی ہیں بوڑھوں کی بھی

شکاریوں کی بھی ہیں فوجیوں کی بھی

بادشاہوں کی بھی غلاموں کی بھی

پاپیوں کی بھی اور صوفیوں کی بھی

آپ لوگ ان کہانیوں کو

غور سے رات بھر سنتے ہیں

اور جب

چاند بادلوں میں چھپ جاتا ہے

ستارے تھک جاتے ہیں

انگیٹھیاں سرد پڑ جاتی ہیں

تب ہم سب دُنیا و مافیہا سے بے خبر سو جاتے ہیں

یہ جانتے ہوئے

کہ کچھ مسافر اگلی صبح

انجانے سفر پر روانہ ہو جائیں گے

اور کچھ دوست

اگلی شام

ایک نئی کہانی سننے آ جائیں گے

مئی ۲۰۰۴ء

نئی کہانی

عزیز دوستو اور مسافرو!

آج رات میں آپ کو

ایک نئی کہانی سنانا چاہتا ہوں

ایک ایسے لڑکے کی کہانی

جو اپنے گھر میں بھی بے گھر تھا

جو اپنے شہر میں بھی اجنبی تھا

جو اپنی دھرتی کا سوتیلا بیٹا تھا

چنانچہ

دھرتی ماں کے دیگر سوتیلے بیٹوں کی طرح

ایک رات

وہ چند کپڑوں اور کتابوں کے ساتھ

شہر چھوڑ کر چلا گیا

نجانے کب تک وہ مسافر رہا

کبھی پہاڑوں سے گزرا کبھی وادیوں سے

کبھی سمندروں سے گزرا کبھی جنگلوں سے

کبھی صحراؤں سے گزرا کبھی بیابانوں سے

آخر اس نے

ایک نیا گھر، نیا شہر

نئی دھرتی ماں تلاش کر لی

ایسی دھرتی ماں جہاں

اسے خوف نہ تھا کہ وہ

دل کی بات کرے گا تو جیل میں ڈال دیا جائے گا

سچی بات کرے گا تو سولی پر چڑھا دیا جائے گا

محبت کرے گا تو سنگسار کر دیا جائے گا

نئی دھرتی پر، نئی دُنیا میں

اسے ایسے لوگ ملے

جو رنگ، نسل، زبان اور مذہب

کے فرق کو خوش آمدید کہتے تھے

اس دھرتی پر

اسے ذہنی سکون ملا

وہاں وہ

اپنی ذات

اور شہر کے لوگوں کے ساتھ

پرامن زندگی گزارنے لگا

مئی ۲۰۰۴ء

درویشوں کا ڈیرا

کل شام
درویشوں کے ڈیرے میں
مہمان ادیبوں اور فنکاروں سے ملنے کے بعد
گھر لوٹتے ہوئے
میں سوچ رہا تھا
جب مہاجر پرندے
کسی نئے شہر کے
نئے باغ میں جاتے ہیں
تو وہ صرف ان شاخوں پر گھونسلے بناتے ہیں
جن سے انہیں اپنائیت کی خوشبو آتی ہے
شاید یہی وجہ ہے کہ جب
دنیا بھر کے شاعر اور ادیب' فلاسفر اور فنکار
ہمارے شہر میں داخل ہوتے ہیں
تو چاہت کے کچے دھاگے سے کھنچے
خضر کی کٹیا میں چلے آتے ہیں
وہ اس کٹیا میں
آتشدان کے گرد بیٹھتے ہیں
اپنی غزلیں' نظمیں' کہانیاں سناتے ہیں
اور اگلے دن
نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں
لیکن ان کی باتوں کی خوشبو

چائے کی پیالیوں کے ہمراہ
خضر کے گھر میں رہ جاتی ہے
خضر کا کہنا ہے
ہر فنکار کے دل کے نہاں خانوں میں ایک درویش چھپا ہوتا ہے
جو دوسرے فنکاروں اور درویشوں کی قربت میں پروان چڑھتا ہے
خضر نوجوان فنکاروں کو
بزرگ فنکاروں سے
مشرقی فنکاروں کو مغربی فنکاروں سے ملواتا ہے
اور مختلف فنکاروں کے درمیان
ایک تخلیقی پل بنتا ہے
اس کا ڈیرا
ایک جھیل کے کنارے واقع ہے
جس کی کھڑکی سے
آبی پرندے اور سایہ دار درخت دکھائی دیتے ہیں
اس کا ڈیرا
روشنی کا مینار ہے
جس سے بھولے بھٹکے مسافر اپنی منزل
اور فنکار اپنا ساحل پاتے ہیں
میں درویشوں کے ڈیرے میں جب بھی جاتا ہوں
اور نئی نظمیں، غزلیں اور کہانیاں سنتا ہوں
تو میرے ذوق کو جلا ملتی ہے
مجھے بھی نئی نظم لکھنے، نئی کہانی تخلیق کرنے اور
نیا خواب دیکھنے کی تحریک ہوتی ہے

مجھے وہ شام یاد ہے

جب اس کے زمانۂ طالبعلمی کے بہت سے دوست

اس سے ملنے آئے تھے

ایسے دوست جنہوں نے نوجوانی میں خوابوں کے شیش محل بنائے تھے

وہ ہر ظلم کے خلاف بغاوت

اور

ہر جبر کے خلاف احتجاج

کرنے کو تیار تھے

ان دنوں وہ سب تخلیق کار آپس میں ملتے تھے

ایک دوسرے کو

امن اور آشتی کی نظمیں

اور

پیار اور محبت کی کہانیاں سناتے تھے

لیکن جب

طالبعلمی کا دور ختم ہوا

اور عملی زندگی کا دور شروع ہوا تو

خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہونے شروع ہو گئے

پہلا گروہ ان نوجوانوں کا تھا

جنہوں نے والدین کے کہنے پر

شادیاں کیں

بچے پیدا کئے

اور

روایتوں کی زنجیروں میں بندھ گئے

انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو

خاندان بنانے کی بھینٹ چڑھادیا

وہ دن بھر کی محنت

اور

بیوی بچوں کی خدمت سے

اتنے تھک جاتے کہ انہیں

سیر کے لئے جانے

شاعری پڑھنے

اور

موسیقی سننے کا وقت ہی نہ ملتا

ان کی ذمہ داریاں

ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو

دیمک کی طرح کھا گئی تھیں

دوسرے گروہ کے اعصاب پر

دولت سوار تھی

انہیں اندازہ ہوا

فنکار خوابوں کا بیوپار کرتے ہیں

اور اس مادی دنیا میں لوگ

بڑے گھر اور قیمتی گاڑیاں خریدنا چاہتے ہیں

خواب نہیں

ایسے فنکار اور دانشور

دولت اور سونا جمع کرنے لگے

انہوں نے قیمتی پینٹنگز خرید کر

گھروں کی دیواروں پر لگائیں

اور

قیمتی کتابیں خرید کر

میزوں اور شیلفوں پر سجائیں

لیکن ان کتابوں کے لکھاریوں اور پینٹنگز کے فنکاروں سے

کبھی ملنے نہ گئے

تیسرے گروہ کو

مشہور ہونے کی بہت آرزو تھی

انہیں شہ پارے تخلیق کرنے کی بجائے

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر

انٹرویو دینے کا زیادہ شوق تھا

وہ فن کی ریاضت سے کتراتے تھے

ایسے لکھاری

مشہور تو ہو گئے

لیکن ساری عمر سستے کالم اور ناول لکھتے رہے

وہ عوام کا ذوق کیا بہتر کرتے

وہ اپنا ذوق ہی بگاڑ بیٹھے

چوتھا گروہ

جو روایات کی دیواروں سے

اتنا زور سے ٹکرائے کہ

اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے

اور پاگل خانوں میں داخل کر دیئے گئے

ان کے پاگل پن نے ان کے فن کو گرہن لگا دیا

اس شام مجھے احساس ہوا
خضر ان موددوے چند فنکاروں میں سے تھا
جو اپنے آپ میں مست
اور
اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں
اسے دولت اور شہرت کی کوئی فکر نہ تھی
وہ عمر بھر روایت کی شاہراہ چھوڑ کر
اپنے من کی پگڈنڈی پر چلتا رہا تھا
ربع صدی کی ریاضت کے بعد
وہ شہ پارے تخلیق کرنے کے قابل ہوا تھا
اور
اس کے من میں تخلیقی چشمے بہنے لگے تھے
وہ انعام واکرام سے تو نہ نوازا گیا تھا
لیکن اس نے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا تھا
نجانے کتنے شاعر اور ادیب' دانشور اور فنکار
دور دور سے اس سے ملنے آتے تھے
وہ ان کے دلوں میں راکھ کے نیچے چھپی چنگاریوں کو ہوا دیتا تھا
اور شعلوں میں تبدیل کر دیتا تھا
دھیرے دھیرے مجھے اندازہ ہوا
خضر کتنا خوش قسمت تھا
اس کا ڈیرا دھیرے دھیرے
بہت سے بے گھر شاعروں' دانشوروں اور فنکاروں
کا گھر بن گیا تھا۔

۲۰۰۵ء

جزیرہ

درد کے سمندر میں
رنج و غم کے طوفاں میں
کرب کی فضاؤں میں
بے بسی کی لہروں میں
دور اک جزیرہ ہے
اور اس جزیرے پر
رنگ و بو کے گلشن ہیں
راحتوں کی جھیلیں ہیں
نکہتوں کے صحرا ہیں
آشتی کے جنگل ہیں
ہم نے اس جزیرے پر
ایک دن پہنچنا ہے

دوستوں کی آراء

۔ اپنے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

تحریر: سلطانہ مہر

۔ تمام شہر سے ملتی ہوں جس کی دیواریں
ہم اپنے شہر میں ایسا مکاں تلاش کریں

خالد سہیل

میں آنند نرائن ملا کی 'میری حدیثِ عمر رائگاں' پڑھ رہی تھی۔ آنند جی کا کہنا ہے کہ 'جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لئے سامان فراہم کرسکتا ہے لیکن دل ودماغ کی تربیت نہیں کرسکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے اور عظمت انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے' پھر جب میں نے خالد سہیل کو پڑھا تو ان کی نثر ونظم دونوں ہی مجھے اس قول پر پوری اترتی محسوس ہوئیں۔ ۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو پاکستان میں پیدا ہونے والے اس ادیب اور شاعر نے ہجرت کے دکھ بھی جھیلے ہیں اور تنہائیوں کا کرب بھی سمیٹا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ ۱۹۸۲ء میں کنیڈا کی میموریل یونیورسٹی سے ایف آر سی پی FRCP نفسیات میں کیا۔ کہتے ہیں 'میں نے جب سے لکھنا شروع کیا میری یہی خواہش رہی کہ میں اپنے مشاہدات' تجربات اور خوابوں کو تخلیقی سطح پر پیش کرسکوں'۔ صنف کا چناؤ ان کے لئے ثانوی رہا۔ شاعری ہو یا افسانہ' مضمون ہو یا ناولٹ' انٹرویو ہو یا عالمی ادب کا ترجمہ۔ ان کے لئے یہ سب ایک ہی منزل تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ بنیادی توجہ اس بات پر رہی کہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو تخلیقی طور پر عوام و خواص کے سامنے پیش کرسکیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے لکھنا کب شروع کیا لکھتے ہیں

'میں نے جب زندگی کی آغوش میں آنکھ کھولی تو اپنی چھوٹی سی دنیا کو روایات کی اونچی دیواروں میں محصور پایا۔ خاموشی' تاریکی' اور گھٹن نے میرا استقبال کیا۔ لاکھوں انسان لکیر کے فقیر بنے آباؤاجداد کے نقشِ
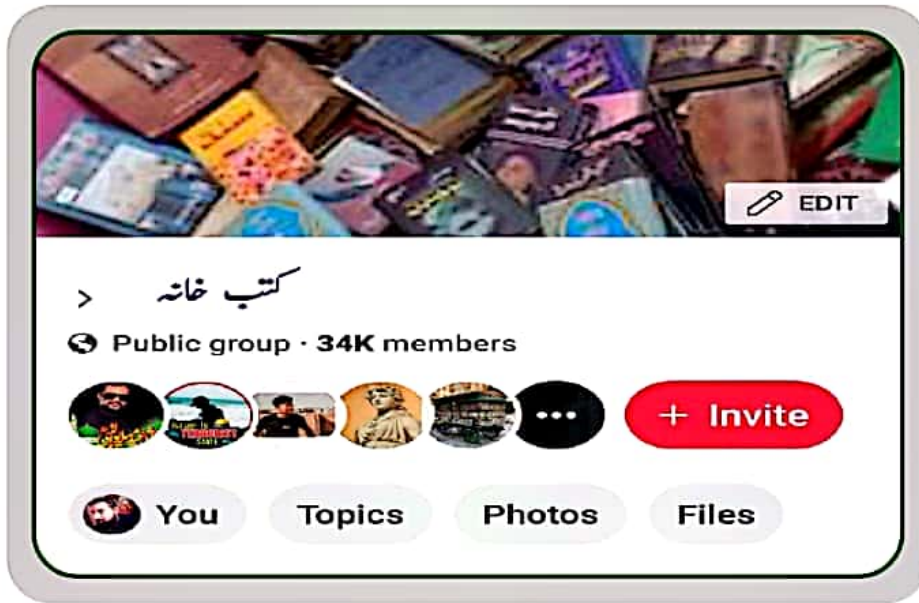
قدم پر چل رہے تھے' فرسودہ طرزِ حیات کو سینوں سے لگائے بیٹھے تھے۔ اس ماحول میں اندھا ایمان قابلِ قدر تھا' شک کرنا گناہ اور سوال پوچھنا جرم۔ میرے سراپا میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔ روایت سے انحراف نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ قابلِ سزا جرم تھا۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھتا تو احساس ہوتا:

؎ اس درجہ روایات کی دیواریں اٹھائیں
نسلوں نے کسی شخص نے باہر نہیں دیکھا

میرا جی چاہتا تھا کہ اس ماحول سے دور' بہت دور بھاگ جاؤں۔

میرے شعور نے جب بلوغت کی طرف قدم بڑھائے تو مجھے پڑھنے اور لکھنے کا جنون ہو گیا۔ میں ساری دنیا سے کٹ کر اپنی ذات میں ایک دنیا بسانے لگا۔ میرا قلم میرا ساتھی بھی تھا اور رقیب بھی۔ مجھے ڈھارس بھی دیتا' میری اقدار پر چرکے بھی لگاتا اور میرے ایمان کو کریدتا بھی رہتا۔ میں نے اپنے قلم کو کدال بنایا تو میرے لئے دیواروں میں کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ میں اپنے ماحول سے ایک عجیب رشتے میں منسلک تھا۔ میں ان ادیبوں اور دانشوروں سے زیادہ قریب تھا جو مدتوں پہلے اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ لیکن میرے آس پاس بسنے والے لاکھوں زندہ انسان ایک ایسی دھند میں ملفوف تھے کہ میرے لئے ان کی پہچان اور اپنی ذات کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ مجھے اس ہجوم میں کھو جانے کا ڈر تھا۔ میں نے قدم قدم پر

؎ اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے
اپنے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

میں جب اپنی تلاش میں چند قدم آگے بڑھا تو میری ملاقات چند ایسے رشتہ داروں' اساتذہ اور دوستوں سے ہوئی جو میری طرح سے اپنے گھروں سے نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ہمارے سامنے شاہراہیں نہ تھیں' پگڈنڈیاں تھیں لیکن ان پگڈنڈیوں پر چند نقشِ قدم ہی حوصلہ افزائی کے لئے کافی تھے۔ ہم زندگی کی کان میں مختلف نظریوں اور ضابطۂ حیات کے مقناطیس لئے کھوٹے کو کھرے سے جدا کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اپنے اپنے تجربات کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔

جب میرے ذہن اور میرے قلب کے کینوس پر کچھ نقوش ابھرنے لگے تو میں نے اپنے افسانوں اور شعروں میں ان کے رنگ بھرنے چاہے۔ میں پرندوں کی طرح اڑنا چاہتا تھا' اونچا' بہت اونچا' ان دیواروں

سے بلند'ان لوگوں کی رسائی سے بہت بالا جو ہاتھوں میں تیر' کمان اور بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

اپنی ذات کی کھوج میں' حقیقت کی جستجو میں' نئی صبحوں کی تلاش میں' میں مشرق و مغرب کی شاہراہوں' صحراؤں' وادیوں' جنگلوں اور شہروں میں گھومتا رہا اور جگہ جگہ اپنی روح کی پیاس بجھاتا رہا'۔

خالد سہیل اس حقیقت سے اتفاق کرتے ہیں کہ عظیم شاعری خارجیت اور داخلیت کو ایک ساتھ سمونے کا ریاض ہے۔ ایک بڑا فنکار بلاشبہ دنیا کے واقعات اور حادثات سے تاثر قبول کرتا ہے' اسکی اپنے ذہن ودل میں پرورش کرتا ہے' اسے اپناتا ہے اور پھر اسے اپنے تخلیقی شعور کی رفعت دیکر تحریر کرتا ہے۔

ان کا بیشتر کلام اس کیفیت کا عکاس ہے۔ خالد ہجرت کے دکھ سے آشنا ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس دکھ کو سمویا ہے۔ وہ کہتے ہیں 'زندگی کا ہر دور اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر لے کر چلتا ہے اور ہر دور کے انسان اپنی جنتِ گم گشتہ میں مصروف رہتے ہیں'

'ہمارا عہد جدید آسائشوں کے ساتھ ساتھ نئے تقاضے بھی لے کر آیا ہے۔ ہم اس حقیقت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دنیا کے ہر گوشے میں بسے ہوئے انسان چاہے وہ کسی بھی رنگ' نسل' زبان اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ جس طرح جسم کا ایک حصہ باقی حصوں سے کٹ کر نشوونما نہیں پا سکتا اسی طرح ایک انسان یا انسانوں کا ایک گروہ باقی انسانوں سے جدا رہ کر زیادہ دیر تک کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانی معاشرے میں انسانیت کی قدرِ مشترک کو جلد یا بدیر قبول کرنا ہوگا۔ یا تو ہم سب مل کر بہتر زندگی کی جستجو کریں گے یا مل کر خودکشی کر لیں گے (پوری انسانیت کا ایٹمی توانائی سے مجموعی طور پر خودکشی کرنا بھی بیسویں صدی میں ہی ممکن ہوا ہے)

جب ہم اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ چاہے وہ جنوبی ایشیا کی معاشی ناہمواریاں ہوں یا مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی اور مذہبی رنجشیں' چاہے وہ شمالی امریکہ کا احساسِ تنہائی ہو یا جنوبی افریقہ کا احساسِ غلامی اور چاہے وہ اقلیتوں کے مسائل ہوں یا عورتوں کے حقوق کی جدوجہد۔ یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں'۔

میرا اگلا سوال سن کر کہ کیا آج کے ادیب نے اپنے قلم کا رشتہ اپنی دھرتی سے جوڑ رکھا ہے؟ خالد کہنے لگے کہ 'ایک ایسے معاشرے کے خدوخال واضح کرنے میں جس کی بنیادیں تعصب' جہالت اور ناانصافی

کے آہنی ستونوں پر قائم ہوں ادب نے ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب نے ہمیشہ اپنے عہد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی میں افراد اور قوموں کے رشتوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں۔ چونکہ ساری دنیا میں میڈیا اور سفر کی سہولتوں نے ایک عالمی گاؤں کی سی صورت پیدا کر دی ہے اس لئے ایک انسان یا قوم کا تجربہ پلک جھپکتے ہی پوری انسانیت کا تجربہ بن جاتا ہے۔ اس تبدیلی نے ہمیں انسانی زندگی کے سفر کی اگلی منزل پر لا کھڑا کیا ہے اور ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہمارے ادیب تجربات کو پورے خلوص سے تخلیقی سطح پر پیش کرنے کی ہمارے سائنسدان (چاہے وہ ماہرینِ نفسیات ہوں یا ماہرینِ بشریات) ان تجربات کی منظم طریقے سے تفہیم کرنے کی اور ہمارے فلاسفر اور دانشور وجدانی طور پر انسانیت کے مستقبل کی پیشین گوئی کرنے کی کوشش کریں۔

انسانی تاریخ کے اس موڑ پر ایک مہاجر ادیب قیادت کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی میں اس کا ایک سے زیادہ تہذیبوں، ثقافتوں، زبانوں اور معاشروں میں زندگی گزارنے کا تجربہ اور اس کا تخلیقی اظہار کاروانِ حیات کا رختِ سفر بن گیا ہے۔ اس تجربے نے اس کی تیسری آنکھ کھول دی ہے۔ ایسی آنکھ جو اسے انسانی روح کے نہاں خانوں میں جھانکنے میں مدد دیتی ہے۔

تخلیقی میدان میں خالد نے شجرِ سایہ دار تلے دم لئے بغیر مسلسل سفر جاری رکھا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے 'تلاش'، 'آزاد فضائیں' اور 'تازہ ہوا کا جھونکا' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چند دیگر کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں جن میں افسانے، ترجمے اور انٹرویو شامل ہیں۔

'زندگی میں خلا'... 'چنگاریاں'... 'ٹوٹا ہوا آدمی'... 'امن کی دیوی'... 'مغربی عورت'... 'ادب اور زندگی'... 'کالے جسموں کی ریاضت'... 'انفرادی اور معاشرتی نفسیات'۔

انگریزی اور پنجابی زبان میں ان کی تخلیقات کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

سلطانہ مہر... پاکستان

ڈاکٹر خالد سہیل... فن اور شخصیت

تخلیق: شکیلہ رفیق

ماہ نامہ 'شاعر' کے مدیر محترم جناب افتخار امام صدیقی کی فرمائش تھی کہ میں گوشۂ خالد سہیل کے لئے کچھ لکھوں اور ان کا کہا میں ٹال نہیں سکتی۔ اب لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچتی ہوں کہ بات وہاں سے کیوں نہ شروع کروں جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

یہ غالباً ۱۹۸۸ء کی بات ہے جب میں پہلی بار visit پر کینیڈا آئی تھی۔ تب رائٹرز فورم کے اس وقت کے صدر جمال زبیری نے میرے اعزاز میں ایک محفل منعقد کی۔ میرا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'کچھ دیر پہلے نیند سے' انہی دنوں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ جس کے چند نسخے میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ میں یہاں کے مقامی لکھنے والوں میں سے کسی سے واقف نہ تھی اس لئے میرے میزبان نے کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے چند ناموں کی نشان دہی کر دی تھی کہ کتابیں ان کو دے دیں جس میں ایک نام خالد سہیل کا بھی تھا۔ میں نے کتابیں مذکورہ حضرات کو دے دیں مگر ان سب نے کتاب کو کیسا پایا اس کا مجھے کوئی علم نہ ہو سکا بلکہ ہمارے ایک مہربان دوست اشفاق حسین کی رائے کا تو آج تک کسی بھی کتاب کے بارے میں کوئی علم نہ ہو سکا۔ خیر یہ بات تو یوں ہی ضمناً زیرِ تحریر آ گئی۔

تو اس نشست میں، میں نے اپنی ایک کہانی 'بند کواڑ' پڑھی جو ان ہی دنوں مشفق خواجہ کے پرچے 'تخلیقی ادب' میں شائع ہوئی تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔ مگر اس محفل میں کہانی سننے کے بعد چند افراد نے کہا 'یہ کہانی ہماری سمجھ میں نہیں آئی، کوئی اور کہانی سنائیں۔' تب پھر میں نے اپنی ایک اور کہانی 'ایک ووٹ' پڑھی جسے سب نے پسند کیا۔

☆

یہ ابھی دو چار برس قبل کی بات ہے جب میں اور خالد سہیل 'اردو کونسل آف کینیڈا' کی دعوت پر مانٹریال جا رہے تھے جہاں میرے اعزاز میں ایک شام تھی اور پھر وہاں مجھے best writer کے ایوارڈ سے نوازا گیا اور یہ ایوارڈ مجھے محترم شان الحق حقی کے مبارک ہاتھوں سے دلوایا گیا۔

مانٹریال کے اس سفر کے دوران خالد سہیل نے اتنے عرصے کے بعد یہ بات بتائی کہ وہ میری کتاب 'کچھ دیر پہلے نیند سے' پڑھنے کے بعد میری کھوج میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میری تین ابتدائی کہانیوں کا موضوع موت کیوں ہے؟ پھر اسی سفر کے دوران انہوں نے میرا ایک طویل انٹرویو کیا جس میں دیگر سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی شامل تھا کہ میں نے اپنی کہانیوں میں موت کو کیوں اتنی اہمیت دی ہے (خیر یہ ایک الگ داستان ہے)

☆

اس پہلے visit کے بعد میرا کینیڈا آنے جانے کا سلسلہ ہر سال شروع ہو گیا کہ امیگریشن کا سلسلہ بھی تھا۔ پھر پی آئی اے کی ملازمت کے سبب آنے جانے میں کوئی دشواری بھی نہ تھی۔

تقریباً ہر بار خالد سہیل سے ملاقات رہی اور کتابوں کا تبادلہ بھی ہوا ایک بار اپنی کتاب 'دو کشتیوں میں سوار' مجھے دی۔ میں اس بات کو اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ صاحبِ کتاب کو کوئی نہ کوئی جواب ضرور دوں۔ پھر مجھے اس کی چند کہانیاں پسند بھی آئی تھیں۔ لہذا خط میں ان کہانیوں کا حوالہ بھی دیا۔ ان کا جواب فوراً ہی آ گیا جس میں بہت سی باتوں کے ساتھ خود میرے اپنے بارے میں بھی ایک اطلاع تھی کہ میں ایک باغی اور لبرل خاتون ہوں اور غیر روایتی زندگی گزارنا پسند کرتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی کے کچھ سوچنے یا سمجھنے پر قطعاً کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ مگر چوں کہ حقیقتاً ایسا تھا نہیں۔ لہذا میں نے خالد سہیل سے بھی زیادہ عجلت برتی اور اسی وقت اس خط کا جواب لکھا کہ آپ غلط سمجھے ہیں۔ چند باتوں میں، میں روایات کی قائل ہوں اور کچھ کو قطعاً پسند نہیں کرتی اور نہ ہی ان پر عمل کرتی ہوں۔ میرے اس خط کا جواب نہیں ملا۔ پھر ایک دو خطوط اور لکھے مگر جواب ندارد۔ تب میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ مگر جب بھی یہاں آنا ہوتا، ملاقات ہوتی اور میں جواب نہ دینے کی شکایت کرتی وہاں جواب میں صرف مسکراہٹ ہوتی اسی لئے اپنی کتاب 'قطار میں کھڑا آدمی' دیتے ہوئے اس پر میں نے لکھا کہ خالد سہیل کے لئے جو خطوط کا جواب نہیں دیتے۔

پھر اب ۱۹۹۸ء سے میں مستقل طور پر کینیڈا میں رہائش پذیر ہوں قبیلے کے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ خالد سہیل سے بھی ملنا ہوتا ہے اور اب موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ وہ میری پوری فیملی سے واقف ہیں، آنا جانا بھی رہتا ہے میرے تینوں بچے جو یہیں مقیم ہیں ان سے بھی ان کی ملاقات ہے بلکہ ہمارے ایک

صاحب زادے عامر حسن توان کی تحریروں اور شخصیت کے مداح بھی ہیں۔

کینیڈا میں رہائش پذیر ادیبوں میں خالد سہیل کا شمار ان لکھنے والوں میں کیا جا سکتا ہے جو مشرق و مغرب دونوں فلسفوں کے رمز شناس ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مسلسل مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں جس میں ناول، افسانہ، شاعری، تنقید اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔

۱۹۸۶ء سے اپنے ادبی سفر کی ابتداء کرنے والے خالد سہیل کی اب تک تقریباً چودہ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، اردو، انگریزی اور پنجابی زبان میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوئی ہیں اور کچھ کتابیں انہوں نے جاوید دانش کے تعاون سے تحریر کی ہیں جیسے 'کالے جسموں کی ریاضت' وغیرہ یوں ہم انہیں مختلف الجہات ادیب بھی کہہ سکتے ہیں۔

چونکہ وہ پیشے کے اعتبار سے ماہر نفسیات ہیں اس لئے ان کے لکھنے میں ان کے پیشے کی مدد شامل رہتی ہے۔ بالخصوص افسانہ نگاری میں انہیں موضوعات کو تلاش کرنے میں سعی نہیں کرنی پڑتی۔ ان کی اکثر کہانیوں میں نفسیاتی مسائل و ذہنی الجھنیں نظر آتی ہیں۔ یوں ان کا پیشہ ان کے لکھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ان کی ایک کتاب ''دو کشتیوں میں سوار'' جس کا تذکرہ میں نے قبل بھی کیا ہے اس میں ان افراد کی ذہنی کشمکش کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے جو اپنا وطن چھوڑ کر مغربی ممالک میں آ بسے ہیں۔ پھر بعض اوقات وہ اپنی کہانیوں میں ایسے موضوعات کا انتخاب بھی کر لیتے ہیں جن کو چھونے سے دوسرے قلم کار یا تو گھبراتے ہیں یا اس ضمن میں ان کی معلومات ناکافی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک کہانی 'ہم زاد' کا ایک فقرا کچھ یوں ہے:

'اس جگہ ایک ایسی عورت دفن ہے جسے تمام عمر لوگ مرد سمجھتے رہے'

اس کہانی میں ایک حساس اور نازک موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ابھی حال میں ان کی ایک کہانی 'خودکشی یا قتل' نظر سے گذری، نظریاتی اختلاف کے باوجود مجھے یہ کہانی یوں اچھی لگی کہ یہ موجودہ عالمی صورتِ حال کے تناظر میں لکھی گئی اور الجھے اور بگڑے حالات کی نمائندگی کی اچھی کوشش ہے۔

ان کی انگریزی میں تحریر کردہ کچھ کتابیں بھی قابلِ توجہ ہیں جس میں red,. yellow and green zone اور اس سلسلے کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ بقول خالد سہیل کے پوری دنیا میں وہ پہلے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب کچھ اور ادیب بھی اس موضوع پر لکھ رہے ہیں اور ان کی اس کتاب نے بہتوں کو زندگی کی نئی راہیں دکھائی ہیں۔ ایک اور انگریزی کی کتاب Sex, Love

and Marriage ہے جوان کی اپنی دوست Bette Davis سے کی گئی خط وکتابت پر مشتمل ہے، جس میں کتاب کے عنوان سے متعلق مسائل پر بحث وگفتگو کی گئی ہے۔ یہاں میں ان کی تمام کتابوں کی فہرست نہیں گنوا سکتی، جسے دلچسپی ہوگی وہ تلاش کر لے گا۔

خالد سہیل شاعری بھی کرتے ہیں ایک بار میں اپنی فیملی کے ساتھ ان کی دعوت پر ان کے گھر گئی تو ان کا گھر دیکھ کر ان کا ہی ایک شعر یاد آ گیا جو ان کی شخصیت و رہن سہن کی مکمل عکاسی کرتا ہے:

ہمارے گھر کی ہر اک چیز بے گھروں کی طرح
شریر بچوں کی بے ربط خواہشوں کی طرح

میرے نزدیک ان کی بڑی خوبی منافق نہ ہونا ہے۔ چونکہ میں خود منافقت سے شدید نفرت کرتی ہوں اس لئے ایسے اشخاص سے میری ذہنی وابستگی ہو جاتی ہے جو منافق نہ ہوں۔ اور یوں تو اس دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو جیون ساتھی کے پہلو میں لیٹے اپنے دوسرے دوست کا تصور کر کے محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں خالد سہیل کا ظاہر و باطن ایک ہے اسی لئے وہ اپنے ذہنی، شخصی اور ذاتی نظریات کا اظہار بلا کسی جھجک کے کر دیتے ہیں۔

وہ نہ صرف ادیب، افسانہ نگار و شاعر ہیں، بلکہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ اور شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود میری دوستی اسی اچھے انسان سے ہے۔

شکیلہ رفیق

۸ جون ۲۰۰۶ء

پانچواں درویش

انور زاہدی

قصہ چہار درویش کا ذکر آتے ہی میر امن دہلوی کی باغ و بہار نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے.لیکن یہاں چار درویشوں کے قصے کو دہرانے کے بجائے اس ایک ایسی باغ و بہار شخصیت کا ذکر ہو رہا ہے جو خود کو درویش کہنے میں کسی جھجک کے بجائے اس پر فخر کرتا ہے اور آپ جانیئے درویش اگر دنیا کہے تو الگ بات لیکن اگر آپ خود کو درویش کہنا یا کہلوانا شروع کر دیں تو یہ کوئی ایسی آساں بات نہیں بلکہ لوہے کے چنے چبانے والا مسئلہ ہے۔ یہاں ایسے ہی ایک درویش سے آپ کی ملاقات کرانی ہے جو لوہے کے چنے چبانے کا شوقین ہے ۔اس خود ساختہ درویش کا نام خالد سہیل ہے.موصوف نے ۱۹۷۴ء میں خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور پھر دشت نوردی کے لیے ایران کی راہ لی لیکن جب وہاں طبیعت سیر نہ ہوئی تو نہ جانے کہاں کہاں کی گرد چھانتا ہوا امریکہ کی راہ کینیڈا جانے کی ٹھانی اور وہاں پہنچ کے ایسا دم لیا کہ نہ صرف کینیڈا میں رہنے والے برصغیر سے متعلق پاکستانی اور ہندوستانی حیران ہیں بلکہ اب تو خود کینیڈین بھی دم بخود ہیں کیونکہ خالد سہیل کا نام تصویر کے ساتھ کینیڈا سے سال بہ سال نکلنے والی کتاب who is who میں شامل ہے اور یہ بات صرف خالد سہیل ہی کے لیئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے اور ملکی سطح پر پاکستان کے لئے بھی باعث فخر ہے۔

کینیڈا پہنچنے پر اپنے ہم زلف کے ہاں سے پہلا فون جو میں نے کیا وہ خالد سہیل سے رابطے کے لئے تھا نہ جانے کیوں ان کا تازہ فون نمبر میرے پاس نہیں تھا، جبکہ چند ماہ قبل ہی خالد سہیل سے اسلام آباد میں بھی ملاقات ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح کئی گھنٹے کی نشست ان کے ساتھ رہی تھی ۔ملاقات کے اختتام پر جب وہ جانے لگے اور ہم سب انہیں خدا حافظ کہنے کو باہر نکلے تو خالد سہیل کو اپنی جدید ماڈل کی اسپورٹس کار کے ساتھ دیکھ کے جہاں خوشی ہوئی وہیں اس کی نمبر پلیٹ سے اوپر انگریزی کے حروف میں لفظ درویش DARVESH کی لگی ہوئی پلیٹ کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی۔

درویش کا یہ انداز محض نرالا ہی نہیں بے حد دلچسپ بھی تھا.اس سے پہلے کسی ایسے درویش کے بارے میں نہ سنا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا درویش دیکھا تھا جو اسپورٹس کار کا بھی شوق رکھتا ہو اور جس کی ای میل

email بھی درویش کے پتے ہی پر پہنچتی ہو۔لفظ درویش کے لغوی معنی ہیں فقیر، گدا، بھکاری، سائیں، سائل، غریب کے علاوہ مسکین، سالک اور خدارسیدہ کے مطالب بھی سامنے آتے ہیں اور ہمارا یہ دوست جسے میں نے پانچواں درویش کہا ہے اس لفظ درویش کے کسی بھی لغوی معنی سے قطعاً کوئی مماثلت نہیں رکھتا کیونکہ فقیر، گدا، بھکاری یا غریب ہونا تو کسی بھی طور اس کے لیے غیر مناسب ہے۔لیکن وہ مجھے مسکین بھی نظر نہیں آتا اور نہ ہی اپنے لائف سٹائل سے وہ دور دور تک کہیں سے بھی خدارسیدہ آدمی دکھائی دیتا ہے۔اسی لفظ درویش کے لیے انگریزی زبان میں 'سینٹ saint' کا مترادف موجود ہے جبکہ اس کے لیئے بھی تارکِ دنیا اور برگزیدہ لوگوں کا ذکر آتا ہے۔خالد سہیل جنہیں میں ایک باغ و بہار شخصیت کہہ چکا ہوں اس 'سینٹ' کی بھی نفی کرتا دکھائی دیتا ہے۔اردو میں ایک لفظ اس قبیل کے لیے اور استعمال ہوتا رہا ہے جسے 'صوفی' کہا گیا ہے۔لفظ صوفی کے لغوی معنی میں ایک ایسے درویش کا ذکر ہوتا ہے جو کمبل اوڑھے رہے۔لفظ 'صوف' کے مطلب میں اون، ریشم، اور نمدے کا ذکر ہے، (ابتدا میں صوفی اسی لباس میں رہتے تھے) لیکن اس لفظ کے جہاں بہت سے اور مطالب تھے، وہیں ایک مطلب، مخلص بھی بتایا گیا ہے، جن سے اہلِ تصوف منسوب ہوئے، اور شائد ایسے ہی کسی صوفی کے بارے میں داغ نے کہا تھا۔

ے بزمِ دشمن میں رہے آپ تو صوفی بن کر
سرخ آنکھوں میں کہاں ہے اثر جامِ شراب

لیکن یہاں بھی صوفی کے لئے لازم ہے، وہ متقی، پارسا، پرہیزگار ہو، بھگت کہلائے پاک صاف رہے، بے گناہ اور معصوم سمجھا جائے۔اور یہ سارے اوصاف تو کڑی پابندیوں کے زمرے میں آتے ہیں، لیکن بات جب صوفیانہ صفات کی ہوتی ہے تو اس میں سادہ مزاجی، درویش پسندی، پارسانہ اطوار، ٹیپ ٹاپ یا بھڑک سے مبرا خوبیاں سامنے آتی ہیں اور جب ذکر صوفیانہ وضع قطع کا ہوتا ہے تو اس میں سادہ وضع، سادہ پن، ریاکاری سے مبرا ایک محبت کرنے والے مزاج کی بات ہوتی ہے۔میں خالد سہیل کو بس اسی قبیل کا ایک درویش کہوں گا، جو مکمل طور پر ایک عملی انسان ہوتے ہوئے بھی، کینیڈا میں دو دہائیوں سے دماغی امراض کے ایک ماہر کی حیثیت سے اپنا کلینک چلا رہا ہے۔شاعر، افسانہ نگار، محقق، اور ایک ممتاز دانشور ہونے کے باوجود اپنی وضع قطع سے، سہیل ایک سیدھا سادھا انسان اور محبت کرنے والا بے لوث اور ایک مخلص دوست ہے۔درویشی درحقیقت کوئی ایسی شےنہیں جسے بازار سے جا کر خرید لایا جائے اور کسی آرائشی لباس کی طرح پہن لیا جائے۔یہ تو انسان

کے اندر کا ایک ایسا جوہر ہے، جس سے خود اس کا مالک بھی اکثر ہی نہیں بلکہ بیشتر اوقات بے خبر رہتا ہے اور اگر کسی انسان کو اس جوہرِ باطنی کا علم ہو جائے یا اس مخفی صلاحیت کی آگہی ہو جائے تو اس سے بڑا خوش قسمت انسان کوئی نہیں، کہ درحقیقت اس صورتحال کے لئے شائد علامہ اقبالؔ نے فرمایا تھا۔

؎ آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے غافل کہ تو
گرچہ قطرہ ہے مثال بحر بے پایاں بھی ہے

اور اس لحاظ سے خالد سہیل واقعی خوش قسمت ہیں، کہ وہ اپنے اندر کے موسم سے بہت جلد آشنا ہو گئے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے موسم میں ہر وقت مست رہتے ہیں۔ اور اس باطنی موسم کے سرد گرم سے ناخوش ہونے کے بجائے اسے اسی موسم کے گلاب چننے اور کانٹوں سے اپنی رگِ جاں کو لہو کرنے کا فن آ گیا ہے۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ وہ صرف پھول ہی چننا چاہتا ہے، کانٹے اسے اچھے نہیں لگتے اور نہ ہی لگنے چاہئیں۔ اب اگر اسے پھول ہی پھول ملتے ہیں تو وہ ایک خوش قسمت انسان سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر کانٹے اس کے نصیب میں لکھ دئے گئے تو وہ ایک بدنصیب انسان ٹھہرتا ہے، حالانکہ گل و خار تو دن رات کی طرح آپس میں لازم و ملزوم ہیں، جیسے بقا اور فنا، اور یہی زندگی ہے کہ جہاں وہ ہمیں دکھ دیتی ہے وہیں سکھ سے بھی آشنا کراتی ہے۔ اور دراصل وہی شخص درویشی کے منصب کو پانے کا حقدار ہے جو موسم کے گرم سرد، زندگی کے دکھ سکھ اور چمن میں پھیلے ہوئے پھولوں اور کانٹوں سے بہ زبان شاعر بیک وقت نباہ کرنے کا فن جانتا ہو۔

؎ گلشن پرست ہوں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

میری اور خالد سہیل کی دوستی کا آغاز آج سے کوئی بارہ برس قبل ایک دن اچانک کینیڈا سے وصول ہونے والے ایک پیکیٹ سے ہوا، جسے کھولا تو اس میں سے ایک آڈیو کیسٹ 'چنگاریاں' کی برآمد ہوئی۔ یہ خالد سہیل کے افسانوں کی کیسٹ تھی، جو میرے لیے واقعی قابل تحیّر تھی کہ ابھی پاکستان میں صرف گانوں، غزلوں، قوالیوں کی کیسٹوں کے سننے کا رواج تھا، لیکن یہ افسانوں کی کیسٹ کینیڈا سے چلی آ رہی تھی۔ ان افسانوں میں اکثر بمبئی سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالے 'شاعر' میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ مگر افسانوں کو یوں کانوں سے پڑھنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ واقعی خالد سہیل نے ایک تو اتنی دور سے دوستی کا ہاتھ بڑھا کے پہل کی تھی جس

کے لیئے میں ممنون تھا دوسرے اس نے 'چنگاریاں' کی کیسیٹ کے ذریعے واقعی روایات کی زنجیریں توڑ کے اردو افسانے کو کیسیٹ کے ذریعے سننے کا ایک نیا پیراہن بھی دے ڈالا تھا۔

یہ ۱۹۸۷ء کی سردیوں کی بات ہے، خالد سہیل سے ایک رابطہ قائم ہو گیا۔ میرا افسانوں کا مجموعہ جب سن اکیانوے میں شائع ہوا تو اس کی ایک کاپی میں نے خالد سہیل کو کینیڈا ارسال کر دی، اور یوں ہماری خط و کتابت کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ سن ترانوے میں مجھے اس کا ایک خط ملا جس میں پاکستان آنے پر انہوں نے مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار تھا، اس سے بڑی بھلا اور کیا خوشی کی بات ہو سکتی تھی، ایک دوست ملنے کی خواہش کر رہا تھا۔

اے ذوق، کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

میں نے جواباً خالد سہیل کو اسلام آباد اپنے ہاں رہنے کی دعوت دی، خالد سہیل کا اسلام آباد میں میرے ہاں چند روزہ قیام یادگار رہا، جس کے دوران ان کے ساتھ کئی ادبی محفلیں ہوئیں، ایک ادبی نشست راولپنڈی پریس کلب میں حلقۂ اربابِ غالب نے منعقد کی، ایک نشست منشا یاد صاحب کے ہاں ہوئی جس میں بہت سے ادیبوں کے علاوہ احمد داؤد جو خود ایک کہانی بن گیا، اپنے توانا قہقہوں اور لطیفوں کے ساتھ موجود تھا۔ ایک محفل میں نے بھی خالد سہیل کے اعزاز میں اپنے ہاں سجائی، تب پاپا (سید مقصود زاہدی) حیات تھے اور ابھی ان کی صحت ٹھیک تھی، اس محفل کے شرکا میں ممتاز مفتی، ڈاکٹر جمیل جالبی، منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد، پروفیسر جلیل عالی، ڈاکٹر اعجاز راہی اور پروفیسر یوسف حسن شامل تھے۔ خالد سہیل سے ان ادبی محفلوں میں بہت کچھ سنا گیا اور اکیلے میں تو اس کی بے شمار غزلیں، نظمیں سننے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت تک خالد سہیل کو کینیڈا میں سکونت اختیار کئے سولہ برس ہو چکے تھے اور وہ سائیکیٹری Psychiatry میں کینیڈا ہی سے ایف آر سی پی FRCP کرنے کے بعد ان دنوں وہاں کے ایک ہسپتال میں ایک سائیکیٹرسٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ۱۹۹۳ء تک یعنی جب پہلی بار ہم دونوں کی ملاقات ہوئی تو خالد سہیل تقریباً ایک درجن کتابوں کا مصنف بن چکا تھا۔ اس کی کتابوں کے نام یوں ہیں:

۱۔ تلاش (شاعری)

۲۔ زندگی میں خلا (افسانے)

۳ ۔بریکنگ دی چینز (افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

۴ ۔اک پیروچ زنجیر (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)

۵ ۔سوغات (بین الاقوامی کہانیوں کا ترجمہ)

۶ ۔بھگوان ایمان انسان (فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ)

۷ ۔مغربی عورت، ادب اور زندگی (مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کا ترجمہ)

۸ ۔چنگاریاں (افسانوں کا کیسیٹ)

۹ ۔ تازہ ہوا کا جھونکا (شاعری کا کیسیٹ)

۱۰۔ ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک (مقالے کا کیسیٹ)

۱۱۔ ٹوٹا ہوا آدمی (دو ناولٹ)

۱۲۔ انفرادی اور معاشرتی نفسیات (ایک ماہر نفسیات کے انٹرویو اور خطوط)

۱۳ Literary Encounters (collection of interviews)

۱۴۔ورثہ (لوک کہانیوں کا ترجمہ)

۱۵۔امن کی دیوی (مشرق وسطیٰ: ۹۱/۹۰ کی جنگ)

۱۶۔کالے جسموں کی ریاضت (افریقی ادب)

۱۷۔ایک باپ کی اولاد (عرب/یہودی مسائل)

۱۸۔دو کشتیوں میں سوار (افسانے)

۱۹۔دھرتی ماں اداس ہے (افسانے)

۲۰۔دریا کے اس پار (ناولٹ)

۲۱۔ہر دور میں مصلوب (گے اور لیزبین ادب، اور زندگی)

۲۲۔پگڈنڈیوں پہ چلنے والے مسافر (ادبی مضامین، تراجم، انٹرویوز)

مگر اس سب کے باوجود جس خالد سہیل سے میری ملاقاتیں اور خط و کتابت رہی وہ ایک ماہر نفسیات ہونے کے ناطے سناب نظر آنے یا ایک شاعر افسانہ نگار اور دانشور ہونے کے بل پہ خود کو طرم خان سمجھنے یا پھر کینیڈا میں اتنی مدت گزار دینے اور ثروت مند ہونے کے باوجود اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دنیا اور تیز و

طرار شخص نظر آنے کے بجائے جیسا عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے، احساسِ تفاخر سے یکسر تہی داماں، ایک بالکل بے نیاز انسان کے روپ میں نظر آیا، ویسے تو بقول میر۔

ہے تہہ دل بتوں کو کیا معلوم
نکلے پردے سے کیا خدا معلوم

لیکن خالد سہیل سے جب بھی ملاقات ہوئی وہ ہمیشہ ایک مخلص دوست ہی طرح ملا۔ اسلام آباد میں ، لاہور میں یا کینیڈا میں، جہاں کہیں اسے دیکھا ہمیشہ ایک تھیلا اس کے کاندھوں پہ نظر آیا جس میں دوستوں کے لیے کتابیں، نوٹس لینے اور پتے لکھنے کے لیے کاغذات، ایک ڈائری، سیاحوں جیسا استری اور کلف سے مبرّا لباس اور باریش چہرے پہ ہر ایک کے لئے مسکراہٹ کے سوا ڈھونڈنے پہ کچھ اور نہ مل سکا۔

زندگی میں طالبِ علمی کے زمانے سے اب تک بہت سے استادوں، جن میں میڈیکل کالج کے پروفیسروں سے لے کر بہت مصروف پرائیویٹ پریکٹس کرنے والے ڈاکٹروں، ادب کے استادوں، ممتاز وکیلوں، صحافیوں، نامور افسانہ نگاروں، قادر الکلام شاعروں، سکہ بند نقادوں اور بطور خاص ماہرین نفسیات اور ذہنی امراض کے ماہرین کو نہ صرف ملنے بلکہ ان میں سے بہت سوں کو خاصا قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ ان حضرات سے بھی ملاقاتیں رہیں جو دیکھتے دیکھتے باریش ہو گئے اور خود کو معتبر سمجھنے اور ذرا ٹھہر ٹھہر کے ایک خاص انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے کم و بیش ان سب کے ہاں احساسِ برتری اور تفاخر کے جذبے کو ہمہ وقت موجزن پایا، لیکن جن دوستوں کی سہیل سے ملاقات رہی ہے یا اس کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اپنی وضع قطع اور بود و باش کے لحاظ سے خالد سہیل ایک ایسا مست الست انسان ہے، جو نہ صرف اپنے حال میں مگن رہتا ہے بلکہ اپنے دوست احباب کے لئے بھی ہمہ وقت مجسمِ خلوص نظر آتا ہے۔ میں نے نہ اسے پریشان دیکھا اور نہ ہی کبھی غصے کا کوئی رنگ اس کے چہرے پہ اترتا دیکھا۔ یوں بھی اپنے جذبات پہ قابو رکھنا کارِ آسان نہیں، کہ آدمی اپنی جبلّی خواہشات کا غلام ہے۔ شاید اسی بات کے پیشِ نظر غالبؔ نے کہا تھا۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اپنی گفتگو بھی خالد سہیل کے ہاں اس قدر مطالعے اور لکھنے پڑھنے کے باوجود، نہ تو ثقہ اسکالروں جیسا رنگ ڈھنگ ملتا ہے، نہ وہ کبھی بھی اپنے کسی نئے ملنے والے کو یہ احساس ہونے دیتا ہے کہ وہ کوئی

ماہرِ نفسیات ہے اور دوسرے انسانوں کی کمزوریاں اور خامیاں ان کے چہرے سے پڑھنے کا فن جانتا ہے، یا وہ ایک دانشور ہوتے ہوئے لٹریری سناب literary snob نظر آنے کی کوشش میں رہے۔ طبعیت میں اتنی ملائمت اور خلوص، اتنا پڑھ لکھنے کے بعد ذرا کم کم ہی نظر آتا ہے، یا یہ کہہ لیں اتنا کچھ پڑھنے لکھنے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ اور اگر یہ وصف قدرت کسی تخلیق کار کو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے علاوہ ودیعت کر دے کہ:

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تو وہ تخلیق کار واقعی نہ صرف ایک خوش قسمت انسان ہے بلکہ صحیح معنوں میں درویشی کے منصب پہ فائز ہونے کی اہلیت سے مالا مال بھی ہے۔

یہ سیلانی طبع انسان، خالد سہیل ۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوا، حالانکہ والدین کا تعلق لاہور سے تھا لیکن خاندانی روایت کے مطابق خالد کی پیدائش اپنی ننھیال میں ہوئی۔ خالد کے اپنے الفاظ میں 'اپنے خاندان کا پہلا نواسہ ہونے کی وجہ سے میں پورے خاندان میں واحد لڑکا تھا۔ اس لئے چاروں طرف بیسیوں عورتیں مجھے کھلانے کے لئے تیار ہی نہیں، آپس میں لڑتی بھی رہتی تھیں۔ میں کتنا خوش قسمت تھا کہ مجھ پر محبت اور شفقت کی بارش ہوتی رہتی اور خوش قسمتی کا وہ احساس اتنا گہرا تھا کہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا'۔ دو برس کی عمر ہی میں خالد سہیل کا پہلا strange encounter لاہور سے کوہاٹ منتقلی تھی، کہنے کو تو یہ پاکستان ہی میں ایک سفر تھا، لیکن شاید خالد سہیل کے ہاں ذہنی اور جسمانی سفر کی یہ وہ ابتدا تھی، جس کی انتہا گو ہمارے سامنے ہے لیکن کسے معلوم کہ یہ ہی انتہا ہے؟ شاید اسے ضمن میں کبھی ٹی ایس ایلیٹ TS ELIOT نے کہا ہوگا

'جسے ہم ابتدا کہتے ہیں، بسا اوقات وہ انتہا ہوتی ہے'

بے شمار بچے اپنے والدین کے ساتھ اچھے اور برے دنوں کے سرد و گرم سے گزرتے ہیں لیکن ہر بچہ اس انداز میں اپنی گذشتہ زندگی کے اوراق نہیں ٹٹولتا اور نہ ہی اسے اپنے والدین، معاشرہ، روایات اور ثقافت کے بارے میں کچھ خبر ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایک نسبتاً حساس بچہ اپنے غم و غصے کا اظہار اپنے کسی کھلونے کو توڑ کر اپنے سے چھوٹے بھائی بہن کی پٹائی کر کے یا اپنی ماں سے بلا وجہ ضد کر کے یا رو رلا کے کر دیتا ہے۔ لیکن جب اس بچے نے بڑے ہو کے 'پانچواں درویش' بننا ہو، تو اسے پہلے خالد سہیل کے جسم و ذہن میں پرورش پانی ہوتی ہے۔ اپنی کتاب 'انفرادی اور معاشرتی نفسیات' میں جسے میں خالد سہیل کی ابتک گزری ہوئی زندگی کا ایک

باب سمجھتا ہوں (اور در حقیقت اگر اس نے آئیندہ کبھی اپنی سوانح مرتب کی، جو کہ یقیناً ہوگی' تو یہی کتاب اس سوانح کا پہلا باب ہو جائے گی) جس میں سہیل ایک جگہ رقم طراز ہے، 'جب میری عمر نو یا دس سال کی تھی تب ہمارے خاندان کی کشتی ایک طوفان سے ٹکرا گئی، ایک جذباتی بحران نے ہمیں آ دبوچا۔ ابا جان بیمار ہو گئے ،ہسپتال میں داخل ہوئے ،علاج ہوا، انہوں نے کالج کی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور ہم سب واپس لاہور چلے گئے، میرے والدین کے لئے کوہاٹ جیسے شہر میں چند سال گزارنا ایک عجیب وغریب تجربہ تھا۔ پیشہ ورانہ لحاظ سے وہ ترقی کا ایک نادر موقع تھا، تنخواہ بہتر تھی اور آرام وآسائش کے مواقع زیادہ تھے۔ لیکن وہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں نہ تو وہ زبان سے آشنا تھے، نہ ثقافت سے واقف۔ ثقافت اور زبان کے حوالے سے ان کے لئے ۱۹۴۷ء میں امرتسر سے لاہور ہجرت کرنا (چونکہ وہ دونوں پنجاب کا حصہ تھے) آسان تھا لیکن لاہور سے کوہاٹ ہجرت کرنا مشکل۔ وہ پختون صحافت کا حصہ نہ بن سکے۔ ثقافتی تضادات کے علاوہ گھریلو تضادات اس پر مستزاد تھے۔ مزاج کے لحاظ سے امی جان اور ابا جان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ امی جان ایک سخت گیر عورت تھیں، جبکہ ابا جان نرم طبیعت کے مالک تھے... ابا جان تقریباً ایک سال بیمار رہے، میں وہ تمام عرصہ پریشان رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔

ابا جان جب صحت مند ہوئے تو ان کی شخصیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ وہ مذہبی ہو گئے اور انہوں نے داڑھی رکھ لی اور پشاور میں ایک ہائی سکول کے ٹیچر کی حیثیت سے نوکری قبول کر لی اور ہمارا مختصر سا خاندان دوبارہ صوبہ سرحد ہجرت کر گیا۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی میں نے خاندان کے اتنے عروج وزوال دیکھ لئے تھے کہ شاید اس عمر کے بہت سے بچوں کو ایسے حالات نہ دیکھنے پڑے ہوں۔ مجھے آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا کہ امی جان زندگی سے خوش نہیں۔ جوں جوں ابا جان کی طبیعت بہتر ہوتی رہی، امی جان کی طبیعت بد تر ہوتی گئی۔ ماحول میں تشنج بڑھا... ابا جان نے مذہب میں پناہ لی اور امی جان نے بیماری میں پناہ لی'

خالد سہیل نے اپنے بچپن کی زندگی، والدین کے بارے میں جو ایک مختصر سا خاکہ کھینچا ہے، اس قسم کے واقعات ہمارے ہاں کی طرزِ معاشرت میں عام سی بات ہیں، کہ اکثر گھروں میں اسی وضع کے بلکہ بعض گھروں میں جہاں ابھی تک جوائنٹ فیملی سسٹم موجود ہے، اس سے بھی بدتر بلکہ خوفناک قسم کے تضادات موجود ہیں، اور یہ ذکر ان خاندانوں کا ہے جہاں خیر سے تعلیم کا چرچا ہے۔ اس کثیر آبادی کی بات رہنے دیں، جہاں ابھی تعلیم کے چراغ روشن ہی نہیں ہوئے، وہاں تو جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ لیکن اصل بات کا ذکر میں پہلے

بھی کر رہا تھا وہ تھیں خالد سہیل کے موجود منصب تک پہنچنے میں حائل وہ ساری کٹھنائیاں جن کے بغیر اس کا درویش بننا ممکن نہیں تھا۔ اگر سہیل ایک عام سا سیدھا سادھا بچہ ہوتا تو وہ بڑا ہو کر بیشک تعلیم یافتہ ہونے پر دوسرے انسانوں کی طرح زندگی گزار رہا ہوتا، یہ بات الگ ہے کہ بچپن میں برداشت کیئے گئے صدموں کے باعث وہ بحیثیت ایک افسر کے کسی دفتر میں ایک بدمزاج انسان کی شہرت رکھتا، اس کے ماتحت اسے گالیاں دیتے پھرتے، اور اگر وہ شادی شدہ ہوتا تو پھر اس کی بیوی اور بچے، کسی نہ کسی ماہر نفسیات یا ذہنی امراض کے کسی اسپیشلسٹ کے پاس چکر لگا رہے ہوتے، اور اس کے گھر بھر کی زندگی اجیرن ہو چکی ہوتی۔ لیکن جب کوئی انسان اپنے گھریلو حالات سے سبق سیکھتا ہے اور اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں اپنے مسائل کے حل کو ایک منطقی استدلال کے ذریعے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خالد سہیل یا اسی قبیل کا کوئی اور انسان بن جاتا ہے۔

خالد سہیل نے اپنے گھریلو حالات سے جو کچھ اخذ کیا اس سے معاشرے کو یہ فائدہ ہوا کہ سہیل خود ایک ذہنی مریض بننے کے بجائے ذہنی امراض کی بیماریوں کا ماہر بن گیا۔ اپنے دکھوں اور خوشیوں کو تلاش کرتا ہوا وہ ایک شاعر بن گیا، معاشرے میں بکھری ہوئی ناانصافیوں نے اسے بے باک افسانہ نگار بنا دیا، لیکن اس نے اسی پہ اکتفا کرنے کے بجائے اپنے علم میں مزید اضافہ کرنے کی ٹھانے رکھی اور اس کے قلم نے پڑھنے والوں کو کبھی دوسری دنیاؤں کی شاعری اور کبھی انجانے دیسوں کی کہانیوں سے روشناس کرایا۔ اس نے بے شمار ترجمے کیئے، مختلف موضوعات پہ مضامین تحریر کیئے، لیکن بقول غالبؔ،

؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی،

اور پھر روزن دل میں ایک نئی کرن در آئی جس نے سہیل کو پاکستان ہندوستان کے تارکینِ وطن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے بارے میں، جو یورپ، شمالی امریکہ اور کینیڈا کے شہروں میں اپنی ثقافت، زبان اور تہذیب سے ہزاروں میل کی مسافت پہ نئی زبانوں، اجنبی تہذیبوں اور یکسر مختلف ثقافتوں کی چھتریوں کے زیر سایہ بیٹھے ہوئے زندگی گزار رہے تھے، اپنی ہجرت کے باعث 'دریائے اردو ادب' کے مرکزی دھارے سے بہت دور ہو چکے تھے، ایک نئی راہ دکھائی اور خالد سہیل کو ان تارکین وطن ادیبوں کے انٹرویو لینے کا خیال آ گیا۔

خالد سہیل کے انٹرویوز پہ مبنی کتاب Literary Encounters، ان دور دیس میں رہنے والوں کے لئے نہ صرف ایک انتہائی پر خلوص تحفہ ہے، بلکہ آنے والے برسوں میں دنیا میں اردو ادب پہ کام

کرنے والوں کے لئے ایک انتہائی معتبر ریفرنس بک کی حیثیت رکھتی ہے۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس شخص میں کس قدر حوصلہ اور ساتھ ہی کتنی لگن ہے کہ بس لکھے چلا جا رہا ہے،اور اس کی تخلیقات کا دائرہ محض شاعری یا افسانے تک ہی محدود نہیں، جیسے کہ عام طور سے تخلیق کار حضرات شاعری اور افسانے کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔سہیل کو اپنی ذات کے اظہار کا پورا خیال ہے لیکن بایں ہمہ وہ دوسروں کی ذات میں بھی دلچسپی رکھتا ہے،وہ اپنے نفسیاتی مریضوں کو بھی اپنے افسانوں کا کردار بنالیتا ہے،اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کے پیچیدہ مسائل کے لئے حل تلاش کرنے کی کوشش میں مستغرق رہتا ہے۔اسے صرف دوسرے ادیبوں کی ہی فکر لاحق نہیں رہتی،وہ دوسرے دیسوں کے ادب اور شاعری کا شوق سے مطالعہ کرتا ہے اور سفر کرتا ہے کینیڈا سے کبھی امریکہ،لندن،تو کبھی یروشلم،پاکستان،ہندوستان اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرتا ہے،وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ دوسرے دیسوں میں انسانوں پر کیا بیت رہی ہے،اور پھر صرف شاعری ہی نہیں،اس کی تخلیقی کاوشوں میں دنیا جہان کی سیاست اور نفسیات کے وہ پر پیچ مسائل بھی آ جاتے ہیں،جنہیں بیشتر لکھنے والوں نے صرف نظر کیا ہے۔

خالد سہیل کا تقریباً دو دہائیوں تک تجرد کی زندگی گزارنا میری دانست میں اپنے ناآسودہ بچپن اور گھریلو تضادات کا ایک ردِعمل بھی تھا اور شعوری طور پر ایک فیملی لائف اور سماجی بندھنوں سے ایک طرح کا فرار بھی،جس کی پرچھائیوں کو اس کی کتاب' انفرادی اور معاشرتی نفسیات' میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔وہ مغربی ممالک میں رہتے ہوئے ایک آزاد منش اور ذہنی طور پر ایک لبریٹیڈ انسان ہونے کے ناطے ان گنت مغربی لڑکیوں کے ساتھ 'ڈیٹینگ' کرتا ہے،اس کے باوجود ایک دن جب ہسپتال کی ایک رفیقِ کار اسے لنچ پہ دعوت دیتی ہے اور کھانے کے دوران اس سے کہتی ہے،

''میں کتنے ہفتوں سے اشارتاً اظہار کر رہی ہوں،تم سمجھتے کیوں نہیں؟۔''

''میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا

''میں چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ ایک افیئر affair ہو جائے''

'کیا تم شادی شدہ نہیں؟ کیا تمہاری ایک بیٹی نہیں ہے؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا

''تو پھر کیا ہوا'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا،''وہ میرا شوہر ہے تم میرے لوور lover ہو گے''

میں خاموش رہا تو مزید کہنے لگی ''دیکھو سہیل، میں کوئی نادان اور بیوقوف عورت نہیں جو تمہارے عشق

میں آہیں بھرنے لگے گی اور اپنے شوہر کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ رہنے کی التجا کرے گے۔ میں ایک تجربہ کار اور لبریٹیڈ liberated عورت ہوں۔ مجھے اپنا شوہر بھی عزیز ہے، لیکن ایک لوور بھی چاہتی ہوں۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اس قسم کی گفتگو کی امید نہیں تھی۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "مجھے یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ میں تمہارے مقابلے میں ایک روایتی مرد ہوں۔ اس کے علاوہ خفیہ تعلقات رکھنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"اس گفتگو کے چند مہینوں بعد دو اور شادی شدہ عورتوں نے قریب آنا چاہا لیکن میں اپنی پٹڑی نہ بدل سکا۔ میرے پاؤں شل تھے اور دماغ بوجھل"

خالد سہیل کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی یہ چند سطور ("انفرادی اور معاشرتی نفسیات"، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء، صفحہ ۲۷) جہاں اس کے باطنی کردار کی غمازی کر دیتی ہیں، وہیں اس کے ہاں چھپی ہوئی ان تمام کہنہ روایات اور خاندانی رسوم و قیود کی، جن کے خلاف خالد سہیل خود گذشتہ تین دہائیوں سے نبرد آزما ہے، چغلی کھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بحیثیت ایک سائیکیٹرسٹ کے وہ خود اس راز ازل سے بخوبی واقف ہے کہ انسان چاہے بھی تو اپنے اجتماعی لاشعور سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

خالد سہیل کا بحیثیت ایک شاعر، افسانہ نگار اور دانشور کے اردو ادب پہ اور بحیثیت ماہر ذہنی امراض علم نفسیات پہ یہ احسان رہے گا کہ اس نے بے تکان کسی دنیاوی غرض کو محور بنائے بغیر، ایک مستقل لگن کے ساتھ بے لوث انداز میں کام کیا ہے اور وہ اس سلسلے کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ صرف نفسیات کے میدان میں وہ پانچ کتابیں لکھ چکا ہے۔ شاعری کی تین، فکشن کی چار کتابیں، جن میں دو افسانوی مجموعے اور دو ناولٹ شامل ہیں، چار تراجم کے مجموعے، برِصغیر پاک و ہند سے متعلق ان شاعروں اور افسانہ نگاروں کے انٹرویو پہ مبنی ایک کتاب، جو آجکل امریکہ، یورپ، اور کینیڈا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ کتابیں سیاست جیسے ادق موضوعات پر اور پھر اپنی ہی شاعری اور افسانوں کے انگریزی اور پنجابی تراجم اور سفرنامہ ان سب کے علاوہ ہیں۔

تنہائی کی ایک خاصی طویل زندگی گزارنے کے باوجود وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے لحاظ سے بے حد پروڈکٹو productive رہا ہے۔ اور اس تمام مدت میں وہ کون سا موضوع ہے جس پہ خالد سہیل نے طبع آزمائی نہیں کی۔ اب ایک بھرپور زندگی کی طرف اس کی مراجعت یقیناً اس کی تخلیقی قوتوں کو مزید مہمیز دے گی

،کہ اب تو وہ خود یہ کہنے پہ مجبور ہو گیا ہے۔

کبھی اندر کبھی باہر کھلے ہیں، ہماری ذات کے جب در کھلے ہیں

جو بالوں میں سفیدی آ گئی ہے، تو پھر جا کر کبھی خود پر کھلے ہیں

دیکھنا یہ ہے، کہ بالوں میں چاندی کھلنے اور اپنی ذات سے بے تکلفی کے تجربے سے گزر کر ہمارا دوست، خالد سہیل جسے میں نے پانچواں درویش کہا ہے، کس نئے رنگ میں اپنے قارئین کے سامنے آتا ہے ۔خود پہ کھلنے کے بعد اب وہ اپنے پڑھنے والوں پہ کس انداز میں منکشف ہوتا ہے اور اس کی ذات کے در کھلنے سے اردو شاعری اور فکشن میں بطورِ خاص اور نفسیات میں اس کے علاوہ جو اس کا خصوصی میدان ہے، کن نئے موضوعات کا اضافہ ہوتا ہے۔

انور زاہدی

دوستی کا دوست

عرفان احمد عرفی

''میں اپنی ذات کو درخت کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کی جڑیں مشرق کی مٹی میں پیوست توانائی حاصل کر رہی ہوں اور جس کی شاخیں مغرب کی فضا میں جھولتی ہوئی تازہ ہوا میں سرشار ہوں...''

خالد سہیل

ہجرت کے دشت میں جو کوئی بھی اترتا ہے نہتا نہیں ہوتا، اداسی کے محاذ پر یادوں کی سرگرم چھتریوں سمیت جاتا ہے۔ نوسٹیلجیا ایک ایسی کربناک کیفیت کا نام ہے جس کا اندازہ اس کی زد میں آیا ہی کر سکتا ہے، لفظوں اور استعاروں سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر لاکھوں کروڑوں میں ایک ہوتا ہے جو ہجرت کے صحرا میں ایستادہ اس درخت کے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اجنبیت کی آندھیوں کے بے رحم جھکڑ نہ ہوں تو وہ نہ تو اس کی زیرِ زمین پھیلی جڑیں اکھاڑ سکتے ہیں اور نہ فضا میں سر اٹھاتی شاخوں کو پچھاڑ سکتے ہیں۔ خالد سہیل نے ستر کی دہائی میں خیبر میڈیکل کالج پشاور سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد مغرب کی جانب رختِ سفر باندھا، اگرچہ کچھ عرصہ ایران میں بھی پڑاؤ کیا۔ وہ اِن دنوں کینیڈا میں بطور پیشہ ور ماہرِ نفسیات گذشتہ دو دہائیوں سے مقیم ہے یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے سے۔ خالد کا آبائی شہر لاہور ہے اور وہ معروف شاعر عارف عبدالمتین کا بھتیجا ہے بلکہ عارف عبدالمتین کے ساتھ خالد کا رشتہ چچا بھتیجے سے کہیں زیادہ روحانی اور فکری گرو چیلے سا رہا ہے۔

لفظ سے خالد کا تخلیقی رشتہ تو زمانہ طالبِ علمی سے ہی تھا مگر اس کے تخیل کے پرِ نظریے کے پرندے کو جن نت نئے آسمانوں کی جانب باغیانہ اڑان دینے کے درپے تھے، اس فکری تشنگی کا تقاضا تھا کہ وہ منطق اور فلسفے کے ریگزاروں میں شوقِ آوارگی کی دھوپ اوڑھ کر گم ہو جائے... یوں اس کے تجسس نے انسانی نفسیات کے سوال پر سائنسی دستک دی اور زندگی کی پراسراریت کا سامنا کرنے کے لئے درویشی کی بکل اوڑھ لی۔ یوں وہ خیال کے بیابان میں گیان کی کھوج میں نکل پڑا... اس سارے سفر میں اس کا گرو پیچھے کہیں دھوپ یا دھند میں گم ہو گیا۔ یوں بھی تلاش پہلا سبق تھا جس میں اسے ہمیشہ کے لئے اکیلے ہی غبار اوڑھنا تھا۔ وہ لمحہ اس پر

آج بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ خیال کے گیان کی کھوج میں کھویا ہوا فقیر ہر اگلے در کے لئے اپنا کاسہ خالی رکھتا ہے۔

اسے پڑھے لکھے ہونے کا ذرا دعویٰ نہیں حالانکہ دنیا بھر کے ادب عالیہ سے منتخب فلسفہ، سائنس، تصوف، سفرنامہ اور سوانح اس کی ذاتی لائبریری کا اثاثہ ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ وٹبی (کینیڈا) میں اس کی رہائش گاہ کم اور کتب گاہ زیادہ ہے۔ اس سارے مطالعے کے باوجود وہ آج بھی جب آپ کے سامنے بیٹھا آپ کی کوئی علمی یا فکری بات سن رہا ہوتا ہے تو اس کی تشنگی اور حیرت سکول میں آئے پہلے دن کے بچے سے کم نہیں ہوتی ، یہی فقیرانہ رویہ دراصل خالد سہیل کے علم اور دانش سے جینوئن کمٹمنٹ genuine commitment کا ثبوت ہے۔

کینیڈا کی تیز دھاری برفیلی اور یخ بستہ طوفانی ہواؤں میں خالد سہیل کی ادب اور ادیب دوستی آپ پر وابستگی کا جو کمبل اوڑھتی ہے وہ مغرب کے اس سرد مہر رویے سے بنے معاشرے میں مشرق کی تمازت کا ایسا لطف دیتی ہے کہ اس کے ساتھ پہلا تعارف دوستی کی پگڈنڈیاں تا حیات طے کرتے چلے جانے کا وعدہ ٹھہرتا ہے۔

خالد کی پہلی محبت شاعری ہے کہ افسانہ، اس کا فیصلہ نہ اس کا قاری کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ خود صادر کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مطمع نظر وہ واضح تصور ہے جو دراصل اس تخلیق کا محرک ہوتا ہے جو اپنے اظہار کے پیرائے بھی خود لے کر آتا ہے۔ وہ نظم ہے کہ غزل، افسانہ ہے کہ افسانچہ، مضمون، مقالہ گفتگو ہے کہ لیکچر اس کے نزدیک ادیب کی سنجیدگی اور خالص پن اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ اپنی بات قاری یا سامع تک پہنچاپا تا ہے کہ نہیں، قطع نظر اس کے کہ اس میڈیم میں جمالیات یا ہنر کی سطح نقاد یا صرف فنکار کو کس حد تک محظوظ کرتی ہے۔ وہ ادیب اور قاری کے مابین رشتے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے بہ نسبت ادیب اور نقاد کے باہمی تعلق کے۔ وہ ادیب کو دانائی کی سطح پر سنجیدگی اور حساسیت کے تناظر میں کچھ فرائض بجالانے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اس کے نزدیک ادیب کا کام اپنے لوگوں کو کچھ دے کے جانا ہے، خاص طور پر نئی نسل کا ساتھ دیتے ہوئے نت نئے چیلنجز challenges کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب اور نارتھ امریکہ کی موجودہ علمی اور ادبی دنیا کا ایکسپوژر exposure خاص طور پر مشرق کے علمی پس منظر کی بنیاد پر خالد سہیل کو ایک ایسا وژن Vision دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا تخلیقی کام ایک خاص طرح کی modern sensibility کے بغیر judge نہیں کیا جا سکتا۔

خالد سہیل اردو کے ان بہت کم ادیبوں میں سے ہے جو اپنی بات بین الاقوامی پلیٹ فارم سے کہہ رہا ہے اس نے اپنے ادبی مقالے دنیا کی معتبر علمی اور تحقیقی ورکشاپس اور سیمینارز میں پڑھے ہیں۔ اس نے نارتھ امریکا میں رہ کر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تحقیقی اور ادبی کام کیا ہے۔ زندگی کے بارے میں ایک فلاسفی ہے جو وہ اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے explore کئے جا رہا ہے۔ بس اسی تجربے کو شیئر کرنا اس کے لئے اہم ہے۔ Medium اس کے لئے ہمیشہ ثانوی رہا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی زندگی بذاتِ خود اتنی قابلِ رشک مسٹری ہے اور جو شاید اس کے پروفیشن کی وجہ سے بھی ہے کہ اس کا ہر تجربہ ایک multi-dimentional man کے تجربے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اردو کے معروف شاعر اور فیض احمد فیض کے قریبی دوستوں میں سے ایک نام اشفاق حسین بھی کینیڈا میں ہی مقیم ہیں اور خالد سہیل کے بہت قریبی دوست بھی ہیں، ان سے پوچھا جائے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ خالد سہیل کو عمر بھر صرف افسانے ہی لکھنے چاہئیں لیکن خالد سہیل نے شعوری طور پر کبھی نہیں سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہئے... اس کی زندگی کا کوئی سا بھی فکری تجربہ اگر شعر میں ڈھلتا ہے تو وہ اسے شعوری کوشش دیکر افسانے میں نہیں ڈھال سکتا۔ جو شخص اپنی عملی زندگی میں کسی بھی institution میں fit نہیں ہوسکتا وہ تخلیق اور فن کے میدان میں کسی بھی ایک صنف یا اظہار کے پیرائے کو اپنی شناخت کیونکر بننے دے۔ وہ لکھنے لکھانے کے عمل میں بھی ایک multidisciplinary پوائنٹ آف ویو کا قائل ہے۔ اب تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ سب لوگ جو زندگی میں ایک جمالیاتی تبدیلی لانا چاہتے ہیں انہیں ٹیم ورک کی شکل دینی چاہیے لیکن اردو کے کتنے شاعر اور ادیب ہیں جو فنونِ لطیفہ کے دوسرے شعبہ جات سے متعلقہ فنکاروں مثلاً مصوروں، موسیقاروں اور ڈانسرز کے ساتھ مل کر کوئی کام کرتے ہیں۔

خالد سہیل کے نفسیاتی مضامین میں نظمیں بھی ملتی ہیں اور تمام ادبی اور فنکارانہ حوالے بھی، اسی طرح اس کے افسانے میں ضرورت کے مطابق سائنسی توجیہات اور معلومات بھی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ یقیناً کسی بھی ادب پارے کا جمالیاتی پہلو اہم سمجھتا ہے لیکن اس کے نزدیک ادیب کی اس سے بھی اگلے قدم تک ایک ذمہ داری ضرور ہے کہ اگر وہ اپنے قاری کو کسی بھی نفسیاتی یا روحانی مسئلے کا کوئی راستہ سجھا دے تو بعید نہیں، سینکڑوں میں سے کوئی ایک زندگی کے کرب سے نجات حاصل کر پائے۔ اس کی وجہ شاید اس کی پیشہ ورانہ گرومنگ grooming بھی ہے۔

بنیادی طور پر وہ انسان دوستی کا قائل ہے۔ وہ انسان کے تہذیبی ارتقاء کی آئندہ شکل اس بین الاقوامی یگانگت میں دیکھتا ہے جب جنس، رنگ، نسل، مذہب، نفسیاتی اور جسمانی بیماری، جنسیت (جنسی ترجیح) اور قومیت کی بنیاد پر زمین کی اس بستی پر انسان کے کنبے میں کسی بھی نوعیت کی کوئی تقسیم نہ رہے گی۔

وہ خود کہتا ہے۔

؎ تمام شہر سے ملتی ہوں جس کی دیواریں
ہم اپنے شہر میں ایسا مکاں تلاش کریں

وِٹبی (کینیڈا) میں خالد سہیل کی رہائش گاہ کے دروازے واقعی ہر اہلِ فکر ونظر مسافر، مہمان اور مہاجر کے لئے اس طرح کھلے ہیں جیسے اس کے دل کی کشادگی میں زندگی انسان، عورت اور سماج کے نظاموں کی زد میں آئے ہوئے ہر قوم، مذہب، رنگ، نسل اور جنس کے لوگوں کے دکھ ڈیرا ڈالے ہوئے ہوں۔ خالد نے شمالی امریکہ کے معاشرے میں رہ کر کسی باہر سے آئے ہوئے دانش ور کی طرح وہاں کے انسان کے دکھ محسوس نہیں کئے بلکہ ان کے اپنے سماج کے ایک فعال اور احساس فنکار کی طرح اظہار کے منصب سے سبکدوش ہوا ہے۔

؎ طلاق یافتہ ماں باپ کے حسین بچے
کبھی تو باپ کے کبھی اپنی ماں کے بچے ہیں

اسی طرح خالد کی نظم لیسبین (lesbian) جس میں ایک عورت اپنی محبوبہ کے قتل کے الزام میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑی اپنے جرم کا اعتراف محبت کے فخر میں سرشار ہو کر کر رہی ہے، زندگی کے المیے کو جینڈر gender سے ماورا ہو کر محسوس کرنے کی عظیم مثال ہے۔ نہ صرف یہ اس نے اپنے مریضوں کے دکھ کو بھی غزل اور نظم میں بیان کیا ہے، جو اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔

؎ خودکشی میں نہ کامیاب ہوئے
اپنے دن رات اب عذاب ہوئے

خالد سہیل کے خیال میں مشرق کا آرٹسٹ جمالیات کو نظریے پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فکر اتنی واضح نہیں ہوتی، جتنی فکری وضاحتیں، مشرق کے معاشرے اور عام قاری کو درکار ہیں۔ سارتر جمالیاتی سطح پر بھی سوچتا تھا اور اس کی ایک فلاسفی بھی تھی۔ خالد بھی سمجھتا ہے کہ زندگی کے بارے میں اپنی فلاسفی

اور اپنے تخلیقی اظہار کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ فکری سفر میں ارتقاء کا قائل ہے، نہ کی انقلاب کا۔ شروع شروع میں اس کا اپنا نظریاتی رویہ بھی بہت باغیانہ تھا لیکن اب رفتہ رفتہ اس کے فکری اور نظریاتی رویے میں ٹھہراؤ اور پرامن تبدیلی کا عنصر نمایاں ہونے لگا ہے۔

"تلاش" خالد سہیل کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ شاعری کی طرح اس کے افسانوں میں بھی ہجرت، انسانی نفسیات، فلسفہ' انسانی فکر کے ارتقا میں مذہب اور روایت کا کردار خاص موضوعات ہیں۔ پھر اسی طرح جنوبی افریقہ، پاکستان، اسرائیل، سعودی عرب، کینیڈا اور امریکہ میں رنگ، نسل اور مذہب کی بنیاد پر سماجی دوہرے پن کا شکار معاشرہ، کس طرح اکیسویں صدی میں داخل ہوتی انسان کی تہذیب کو تنزل کی جانب لے جا رہا ہے۔

حکومتی اور سیاسی سطح پر انسانی حقوق کے تحفظ کی دعوے دار قومیں، کس طرح کمزور اقلیتوں کے جذباتی اور روحانی استحصال کے درپے ہیں، خالد کی کہانیوں کے خاص تجرباتی موضوعات ہیں۔

خالد اپنے افسانوں میں بہت بولڈ bold ہے اور وہ "ان ڈائریکٹ" ہونے کے جھنجھٹ میں اس لئے نہیں پڑتا کہ بنیادی طور پر وہ ایک معالج بھی ہے سو وہ اپنے سامنے اجتماعی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا انسانی معاشروں کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں اخلاقیات کی سطح پر زندگی اور موت کی کشمکش میں پاتا ہے تو فوری قلم اٹھائے بغیر رہ نہیں سکتا۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ تخلیقی کام کا فنکارانہ زاویہ دیئے بغیر کسی تجزیہ نگار کی طرح منطق پر یقین رکھتا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہی ہے کہ وہ ایک ایسا فنکار ہے جو فن کے دائرے میں رہتا ہوا اپنے ادب پارے میں ایک واضح conceptual framework کو سامنے لاتا ہے۔ وہ حاشیہ مضمون کو شاعرانہ رنگ تو دیتا ہی ہے لیکن نفس مضمون میں جس نظریے یا فلسفے کی طرف اشارہ کرتا ہے اسے کسی بھی کنفیوژن یا تجرید کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

"زندگی میں خلا" اور "دو کشتیوں میں سوار" دو افسانوی مجموعے ۱۹۸۶ء اور ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئے"... اک پیروچ زنجیر" پنجابی اور breaking the chains انگریزی ترجمے ہیں۔ پھر اسی طرح "ٹوٹا ہوا آدمی" اردو ناولٹ ہے جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا"... بھگوان ایمان اور انسان" فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ ہے۔ اسی طرح "سوغات" عالمی افسانوں کے ترجمے ہیں۔

"مغربی عورت ادب اور زندگی" مغربی خواتین قلمکاروں کی سوانح اور ادبی معرکوں پر مبنی کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی "کالے جسموں کی ریاضت" اور "ہر دور میں مصلوب" ایسی کتابیں جو رنگ اور جنسیت (sexuality) کی بنیاد پر پسی ہوئی مظلوم اقلیتوں کے ادب کے حوالے سے ترتیب دی گئی ہیں خاص طور پر ''گے اور لیسبین'' (gay and lesbian) ادب کے حوالے سے "ہر دور میں مصلوب" اپنی نوعیت کی اردو کی واحد کتاب ہے۔

"Literary Encounters" مغرب میں رہنے والے اردو کے لکھاریوں سے انگریزی میں انٹرویوز کا مجموعہ جو ۱۹۹۲ء میں ترتیب دیا گیا۔ اسی طرح پگڈنڈیوں پر چلنے والے مسافر (۱۹۹۶ء) ان فکر انگیز علمی مضامین انٹرویوز اور تراجم مجموعہ ہے جو سنجیدہ ادب اور فلسفے کا ذوق رکھنے والوں کو ایک خاص نوعیت کی فکری تسکین سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یہی نہیں خالد سہیل نے بین الاقوامی سیاست پر بھی امن کی آواز بلند کی ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ میں مشرق وسطی اور خلیج کی جنگ کے آئینے میں ایک کتاب "امن کی دیوی" (۱۹۹۲ء) میں ترتیب دی جس میں اسرائیل کا سفرنامہ بھی شامل ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ تازہ "ہوا کا جھونکا" (شاعری کا آڈیو کیسٹ) اور چنگاریوں (افسانوں کا کیسٹ) اور ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک (مقالے کا کیسٹ) اردو زبان کی معتبر اور سنجیدہ دانشور سامعین کی تلاش میں مدد دیتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ انگریزی میں نفسیات پر بیشتر کتب اور ڈاکومنٹریز اور اردو میں "انفرادی اور معاشرتی نفسیات" جیسی کتاب خالد سہیل کی ادب فلسفے اور نفسیات کے میدانوں میں قابل ذکر contributions کا ثبوت ہیں۔

اس کے نزدیک ہر مذہب میں دو روایات ہیں۔ ایک روایت انسٹی ٹیوشن کی ہے جس کے نمائندے مولوی اور ایک روایت روحانیت کی ہے۔ جو اسلام کی صوفیانہ روایت ہے۔

وہ باقی روایتوں سے اس لئے مختلف ہے کہ یہ "ہمہ از اوست" کی ہے جس میں خدا ایک خالق اور دنیا ایک تخلیق ہے۔ ایک duality ہے۔ یہودیت اسلام اور عیسائیت میں تصوف کی روایت اسی تصور کے گرد گھومتی ہے جبکہ ہندوازم اور بدھ ازم میں دنیا میں جو کچھ بھی ہے خدا ہے۔ ہمہ اوست تخلیق اور خالق دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ ایک " گریٹ مسٹری" ہے جسے خدا کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں دراصل اپنا اپنا ذاتی تجربہ ہیں آپ کس طرح enlightened ہوتے ہیں۔ یہ آپ خود جانتے ہیں۔ محبت بھی روحانیت

کی طرح ایک ذاتی مسئلہ ہے اسی لئے یہ مختلف بھی ہوتا ہے۔ تخلیقی آدمی کا کام بھی انسٹی ٹیوشن میں رہ کر یا اس سے منسلک رہ کر ممکن نہیں رہ سکتا، اس لئے کہ اداروں کے اپنے مفادات ہوتے ہیں جوان سے وابستہ افراد سے زیادہ اہم ہوتے ہیں، فرد ادارے کے لئے کام کرنا شروع کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ خالد سہیل کا سماجی قد اس کے ادبی قد سے چھوٹا ہے۔ وہ گوشہ نشینی میں اپنے کام میں مگن ہے وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اسکی ذات کو اس کے پس منظر میں زیرِ بحث لائیں بلکہ اس کے کام پر گفتگو کریں اس کے نزدیک سیاسی اور سماجی ردِ عمل کا تخلیقی کام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ انسان دوست humanism کے پیڈسٹل پر ہر مذہب، نسل اور نظریہ رکھنے والے سے دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اصل میں اسکی دوستی ہی دوستی کے ساتھ ہے۔ وہ دوستی کا دوست ہے۔ یہ الگ بات ہے وہ اپنی چھت کے نیچے اکیلا رہتا آیا ہے۔

کینیڈا کے برف زاروں میں اکلاپے کی چادر اوڑھے ایک درویش محبت کی آگ روشن کئے بیٹھا تھا جس کا نام رشید ندیم ہے۔ میں زندگی بھر اس کا احسان بھول نہیں سکتا کیونکہ اس نے چند کتابیں اور خالد سہیل کی دوستی مجھے تحفے میں دی۔

عرفان عرفی

سردیوں کی ایک رات آنسرنگ مشین پر

خالد سہیل کا پیغام

"darvesh has gone in search of himself"

رشید ندیم کا جواب

کہاں ہو تم
مرے شائستۂ محفل
میں کب سے چپ کے جنگل میں
ترستا ہوں کسی سے بات کرنے کو
ادھر باہر ہوا
ہاتھوں میں اپنے خنجرِ یخ بستگی تھامے
گلی میں گھومتی ہے
اور مرے دل میں
کسی افواہ جیسا خوف پھیلا ہے
میں جب بھی فون کرتا ہوں

مشینیں بول اٹھتی ہیں
کوئی وعدہ کوئی پیغام
جو بھی ہے ہمیں دے دو
میں ان سے کس طرح کہہ دوں

حدیثِ دل

دلوں کے طولِ بے مصرف کا قصہ
کسی نارس تمنا کا فسانہ
نفی اثبات کی باتیں
میں اپنی ذات کی باتیں
میں اب ان سے کس طرح کہہ دوں

مجھے تم سے جو ربطِ بے نہایت ہے
تمہیں اس کی قسم
مرا پیغام سنتے ہی
مجھے اک فون کر ڈالو
اور آئندہ سگِ جاں کو
تسلی کی کسی زنجیر سے باندھے بنا
ہرگز نہ جانا

آج کل رشتوں کا یہ عالم ہے
جو بھی نبھ جائے بھلا لگتا ہے

تمام شہر سے ملتی ہوں جس کی دیواریں
ہم اپنے شہر میں ایسا مکاں تلاش کریں

عجب سکون ہے میں جس فضا میں رہتا ہوں
میں اپنی ذات کے غارِ حرا میں رہتا ہوں

۲۰۰۵ء

سچ

کسی کے سچ
کسی کو جھوٹ لگتے ہیں
کسی کے پیار کے سپنے
کسی کے زخم بنتے ہیں
کسی کے سکھ
کسی کو خون کے آنسو رلاتے ہیں
کسی کے خواب گھر والوں کی نیندیں بھی اڑاتے ہیں
ہمارے سچ
ہماری زندگانی کو
کبھی آباد کرتے ہیں
کبھی برباد کرتے ہیں
کبھی اپنوں سے ہم کو دور کرتے ہیں
کبھی ہجرت پہ بھی مجبور کرتے ہیں
ہمارے سچ
ہمیں دانا بناتے ہیں، ہمیں خود سے ملاتے ہیں
ہماری روح کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے ہیں
ہمارے سچ
ہمیں حیران رکھتے ہیں
کبھی مغموم کرتے ہیں
کبھی اس زندگانی کو حسیں رنگوں سے بھرتے ہیں
ہمارے سچ............

۲۰۰۴ء

خالد سہیل

خالد سہیل کی تخلیقات